احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

جولائی 2025ء

عقیدۂ رسالت اور اطاعتِ رسول ﷺ کی حقیقی معرفت

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا علمی و فکری خصوصی خطاب

شانِ اہلِ بیت اطہار علیہم السلام

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری

معاشرتی عدمِ برداشت

اسباب، اثرات اور تدارک

تعلیم و تحقیق سے بیگانگی

ایک سماجی المیہ

خانقاہی نظام اور منہاج القرآن کا تجدیدی کردار

پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی معرکہ آراء تصانیف

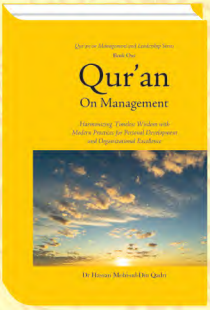

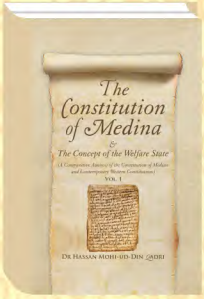

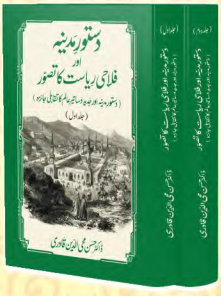

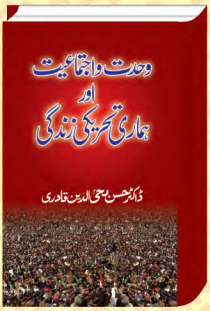

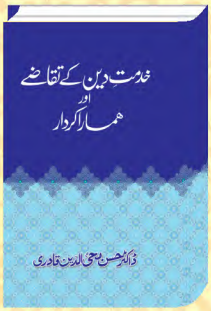

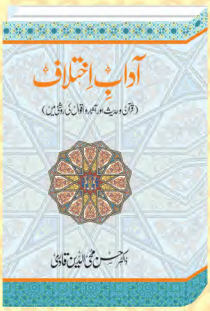

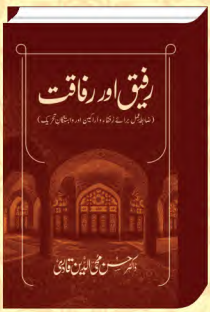

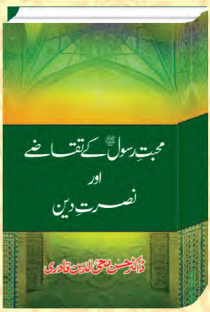

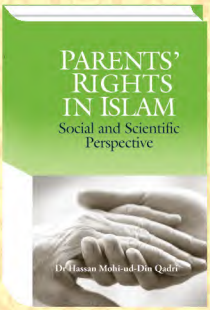

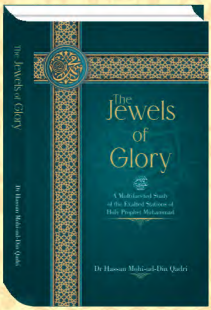

احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

بفیضان نظر
قدوۃ الاولیاء شیخ المشائخ حضرت سیدنا طاہر علاؤالدین القادری الگیلانی البغدادی قدس سرہ العزیز

زیر سرپرستی
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر حسن محی الدین قادری | ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

جلد: 39 / شمارہ: 7 | ۱۴۴۷ھ محرم الحرام / جولائی 2025ء

چیف ایڈیٹر: نور اللہ صدیقی
ایڈیٹر: محمد یوسف
ڈپٹی ایڈیٹر: ابدال احمد میرزا

ایڈیٹوریل بورڈ
محمد رفیق نجم، ڈاکٹر محمد فاروق رانا، عین الحق بغدادی
محمد بلال اُپل، سید علی عباس بخاری، فیصل حسین مشہدی

مجلس مشاورت
خرم نواز گنڈاپور، احمد نواز انجم، جی ایم ملک
محمد جواد حامد، سرفراز احمد خان، منظور حسین قادری
غلام مرتضیٰ علوی، علی عمران، داؤد حسین مشہدی

قلمی معاونین
مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی، محمد شفقت اللہ قادری
ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
ڈاکٹر محمد افضل قادری

حسن ترتیب

اداریہ: تشنگانِ علم اور محبانِ علوم الحدیث کیلئے عظیم خوشخبری	چیف ایڈیٹر	5
القرآن: عقیدۂ رسالت اور اطاعتِ رسول ﷺ کی حقیقی معرفت	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	8
الفقہ: آپ کے فقہی مسائل	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی	21
شانِ اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام	پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری	26
حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری (علیہ السلام)	ڈاکٹر نعیم انور نعمانی	36
معاشرتی عدمِ برداشت: اسباب، اثرات اور تدارک	ڈاکٹر محمد تاج الدین کلامی	45
تعلیم و تحقیق سے بیگانگی: ایک سماجی المیہ	ڈاکٹر زہیر احمد صدیقی	55
خانقاہی نظام اور منہاج القرآن کا تجدیدی کردار	پروفیسر منظور الحسن	64
شخصیت پر سماجی ماحول کے اثرات	عبدالستار منہاجین	74
17 جون: شہدائے ماڈل ٹاؤن کی 11 ویں برسی: دنیا بھر میں تقریبات کا انعقاد		78
From east to west, your vision sprea (Abu Adam Al-shiraazi)		80

کمپیوٹر آپریٹر: محمد اشفاق انجم | گرافکس: عبدالسلام
خطاطی: محمد اکرم قادری | حکاکی: قاضی محمود الاسلام

قیمت فی شمارہ: 60 روپے | سالانہ خریداری: 700 روپے

ملک بھر کے تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
www.minhaj.info
www.facebook.com/minhajulquran
email:mqmujallah@gmail.com (مجلّہ آفس و سالانہ خریداران)
minhaj.membership@gmail.com (نظامت ممبرشپ/رفقاء)
smdfa@minhaj.org (بیرون ملک رفقاء)

انتباہ!
مجلّہ منہاج القرآن میں آنے والے جملہ پرائیویٹ اشتہار خلوص نیت سے شائع کئے جاتے ہیں ادارہ کی کسی کاروبار میں شراکت ہے اور نہ ہی ادارہ فریقین کے درمیان کسی بھی قسم کے لین دین کا ذمہ دار ہوگا۔

بدل اشتراک: مشرق وسطیٰ جنوب مشرقی ایشیاء، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا، مشرق بعید جنوبی امریکہ و ریاستہائے متحدہ امریکہ 30 امریکی ڈالر سالانہ

ترسیل زر کا پتہ: اکاؤنٹ نمبر 02930103644000 میزان بینک شالیمار لنک روڈ لاہور پاکستان

ناشر: محمد اشرف قادری، مطبع: منہاج القرآن پرنٹرز 365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور UAN:042-111-140-140 Ext: 128

حمدِ باری تعالیٰ

میرے رب! کُل کا آسرا تو ہے
سب ہیں مخلوق، اک خدا تو ہے

گلستانوں کو تو نے مہکایا
اور صحراؤں کی بقا تو ہے

تو نے روشن کیا ستاروں کو
مہ و خورشید کی ضیا تو ہے

وحدہٗ لاشریک ذات تری
حَـــیّ و قَیـــوم اے خدا تو ہے

تو ہی رازق ہے کل جہانوں کا
ساری خلقت کو پالتا تو ہے

سارے نبیوں نے دی یہی تعلیم
لائقِ سجدہ کبریا تو ہے

ہر کڑے وقت میں مرے معبود
اپنے عابؔد کا آسرا تو ہے

(ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی)

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

آپؐ کے در پر ہیں خیمہ زن شفا کے قافلے
وجد کے عالم میں ہیں جود و سخا کے قافلے

اڑ رہے ہیں خوشبوؤں کی اقتدا میں رات دن
جانبِ طیبہ نوائے بے نوا کے قافلے

آپؐ مقصودِ حیاتِ ارضِ جان و دل، حضورؐ
ڈھونڈتے ہیں آپؐ کو ارض و سما کے قافلے

ساتھ لایا ہوں در و دیوار کا آقاؐ سلام
ساتھ ہیں میرے حروفِ التجا کے قافلے

عجز کے ہے پیرہن میں اک اک لمحہ، حضورؐ
چھوڑ آئے ہیں عجم میں ہم انا کے قافلے

مانگتے رہتے ہیں ہم اُنؐ سے غلامی کی سند
روز آتے ہیں مدینے میں صبا کے قافلے

زندگی کے گھُپ اندھیروں میں پسِ شامِ غضب
روشنی تقسیم کرتے ہیں حرا کے قافلے

پھول کھلنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا ریاضؔ
آپؐ کی چوکھٹ پہ رہتے ہیں صبا کے قافلے

ریت کی دیوار کیا رستے میں آئے گی ریاضؔ
چل پڑے ہیں سوئے مقتل کربلا کے قافلے

﴿ریاض حسین چودھری﴾

اداریہ

تشنگانِ علم اور محبانِ علوم الحدیث کیلئے عظیم خوشخبری

نظام المدارس پاکستان کے زیرِ اہتمام اور جامعہ اِسلامیہ منہاج القرآن کے تعاون سے ''درسِ علوم الحدیث و ختم البخاری'' کا عظیم الشان دوسرا سالانہ علمی، فنی اور تدریسی اِجتماع 23 نومبر 2025ء بروز اتوار بعد نمازِ مغرب منہاج یونیورسٹی لاہور کے سبزہ زار میں منعقد ہوگا۔ اِس تاریخ ساز اِجتماع میں حجۃ المحدثین شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ عصرِ حاضر میں فتنۂ اِنکارِ حجیتِ حدیث و سنت کا تدارک فرمائیں گے۔ شیخ الاسلام اِس علمی اور فنی اِجتماع میں علمُ اُصولِ الحدیث کے بعض اَہم پہلو اُجاگر کریں گے اور علمُ الجرحِ والتعدیل کی خصوصی اَبحاث کے ساتھ ساتھ حسبِ سابق صحیح البخاری کے نئے اَبواب بھی پڑھائیں گے۔ شیخ الاسلام فہمِ قرآن اور فہمِ دین کے لیے حدیث و سنت کی ناگزیریت اور اَحکامِ دین اور شریعتِ اِسلامیہ میں حدیث و سنت کی مصدری اَہمیت پر حکمت و معرفت اور علمی دلائل سے معمور درس اِرشاد فرمائیں گے۔ اِس سے یقینی طور پر علومِ اِسلامیہ کے محققین، علماء و مدرسین اور طلبہ و طالبات کی علمی، فکری اور فہمی صلاحیت کو جِلا ملے گی۔ ''درسِ علوم الحدیث و ختم البخاری'' کے اِس دوسرے تاریخی اِجتماع میں ملک بھر سے شیوخ الحدیث، علماء کرام، اَعلیٰ تعلیمی اداروں کے پروفیسرز، لیکچررز، مدارسِ دینیہ کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ رجسٹریشن کا باقاعدہ آغاز 24 جون 2025ء سے ہو چکا ہے۔ شرکاءِ درس کو 2 الگ الگ اَسناد دی جائیں گی: ایک سند سماعِ صحیح البخاری کی ہوگی اور دوسری سند اِجازتِ علوم الحدیث کی ہوگی۔ یہ اَسناد شرکاء کے لیے اِس علمی سفر کی عظیم یادگار ہوں گی۔

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات اور کلِ عالمِ انسانیت کے لئے اَحسن و اَجمل منشورِ زندگی ہے۔ قرآن و سنت، شریعتِ اسلامی کی بنیاد ہیں، قرآنِ حکیم سب سے آخری الہامی کتاب اور حضرت محمد ﷺ اللہ

تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کے لئے قرآنِ مجید ہدایتِ ربانی کا اولین سرچشمہ ہے اور حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ بہترین اسوۂ اور نمونۂ عمل ہے۔ قرآن حکیم حضور نبی اکرم ﷺ کے قلبِ اطہر پر نازل ہوا جسے کاتبین وحی نے آپ ﷺ سے سُنا اور لکھ کر محفوظ کر لیا۔ قرآنِ حکیم کا یہ ابدی اعجاز ہے کہ اُس کا ایک ایک حرف روزِ اول کی طرح اصل حالت میں تروتازہ اور محفوظ ہے۔ آج اسلام کی سب سے بڑی حقیقت کتابِ زندہ قرآن مجید ہے۔ قرآنِ حکیم کے بعد شریعت اسلامی کا اہم ترین ماخذ سُنت رسول ﷺ ہے۔ حضور رحمتِ عالم ﷺ کی سُنتِ مطہرہ اور سیرت طیبہ دینِ اسلام کی دوسری بڑی اساس ہے۔ قرآنِ مجید کی طرح صاحبِ قرآن ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا بھی ایک ایک گوشہ الفاظ اور اعمال میں محفوظ ہے اور کھلی کتاب کی طرح اربابِ فکر و نظر کے سامنے موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو اُمت کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: ”فی الحقیقت تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ کی ذات) میں نہایت ہی حسین نمونۂ (حیات) ہے۔“ اتباعِ حدیثِ وسُنت کے باب میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اور اللہ اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے“۔ سورہ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”(اے حبیب!) آپ فرمادیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنالے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف فرمادے گا، اور اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے۔“

اطاعت واتباع رسول ﷺ کے واجب ہونے کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کی کامل پیروی کی جائے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حلت و حرمت یعنی کسی کام کے کرنے کا حکم دینے اور کسی کام سے منع کرنے کا اختیار بھی عطا فرمایا ہے۔ سورۃ الحشر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اور جو کچھ رسول (ﷺ) تمہیں عطا فرمائیں سو اُسے لے لیا کرو اور جس سے تمہیں منع فرمائیں سو (اُس سے) رُک جایا کرو۔“ آپ ﷺ کی سُنت و حدیث کو حجیت میں وہی درجہ حاصل ہے جو قرآن مجید کا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرآن مجید وحی متلو کا درجہ رکھتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ” اور وہ (اپنی) خواہش سے کلام نہیں کرتے، اُن کا ارشاد سَراسَر وحی ہوتا ہے جو انہیں کی جاتی ہے۔“ حدیث وسُنت کا قرآن کی طرح حجت ہونا فرامین رسول ﷺ سے بھی ثابت ہے جیسا کہ حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”خبردار! مجھے قرآن کے ساتھ اس جیسی ایک اور چیز (یعنی سنت) بھی دی گئی ہے۔“ کتاب و سنت دونوں لازم و ملزم ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ” میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں جب

تک اُنہیں مضبوطی سے تھامے رکھو گے (کبھی) گمراہ نہ ہو گے، (واضح رہے کہ) وہ (چیزیں) اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت ہے۔"

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ رواں صدی کی وہ خوش بخت ہستی ہیں کہ جنہیں اللہ رب العزت نے فروغِ علوم القرآن کے ساتھ ساتھ فروغِ علوم الحدیث کے حوالے سے بھی بے پایاں توفیقات سے نوازا اور آپ فروغ علوم الحدیث کے لئے شب و روز وقف کئے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں آپ کو 8 جلدوں پر مشتمل "الموسوعۃ القادریۃ في العلوم الحدیثیۃ" کی تالیف و تدوین کی سعادت ملی جسے عرب و عجم کے علمی حلقوں میں بے حد پذیرائی مل رہی ہے۔ شیخ الاسلام حدیث کی معتبر و نامور کتابِ حدیث صحیح بخاری کی خدمت میں بھی پیش پیش ہیں۔ امام بخاریؒ کا نام علم، دیانت، تقویٰ، فہم اور حافظے کی معراج ہے۔ آپؒ نے اپنی زندگی کو طلبِ علم کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ آپؒ نے دنیا بھر کے سفر کئے، اپنے عہد کے جلیل القدر محدثین سے ملاقاتیں کیں، لاکھوں احادیث جمع کیں اور سخت ترین علمی و فنی معیار پر جانچ کر الجامع الصحیح یعنی الصحیح البخاری مرتب کی۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے کتاب میں صرف وہ احادیث درج کی ہیں جو صحیح ترین اور علمی و فنی پیمانوں پر پورا اترتی ہیں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ صحیح البخاری کو تمام اُمت نے قبولیت کا درجہ دیا ہے۔ صحیح البخاری صرف علم کا نمونہ نہیں بلکہ دیانت اور احتیاط کا شاہکار بھی ہے۔ امام بخاریؒ کسی راوی سے حدیث لینے سے قبل اُس کے کردار، حافظے، صداقت اور اُس کے معمولاتِ زندگی کا بھی جائزہ لیتے تھے۔ صحیح البخاری کو ہر دور میں علما و محدثین، فقہا و مفسرین نے مرجع اول قرار دیا۔ دینی مدارس کے نصاب میں اسے کتاب حدیث کے نصاب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس پر بے شمار شروح لکھی گئیں۔

گزشتہ سال منہاج القرآن کے زیر اہتمام نظام المدارس پاکستان کے تعاون سے پاکستان ہی نہیں برصغیر پاک و ہند میں پہلی بار اپنی نوعیت کا منفرد "درسِ علوم الحدیث و ختم البخاری" کا عظیم الشان تدریسی اجتماع منعقد کرنے کی سعادت میسر آئی۔ اس تدریسی، علمی و روحانی اجتماع میں ہزارہا علمائے کرام، مدرسین، پروفیسرز، طلباء و طالبات نے شرکت کی۔ اس کامیاب اجتماع کے بعد ملک بھر کے علمائے کرام کے بے حد اسرار پر رواں سال 23 نومبر 2025ء کو "درسِ علوم الحدیث و ختم البخاری" کا دوسرا سالانہ اجتماع منعقد ہو رہا ہے۔ حجۃ المحدثین شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری اہلِ علم کی میراث اور روایات کو آج کے عہد میں زندہ رکھے ہوئے ہیں اور درسِ علوم الحدیث و ختم صحیح البخاری کے ذریعے ایمانیات کے باب میں بنیادی تعلیمات کا ایمانی جوش و جذبہ کے ساتھ تحفظ و دفاع فرما رہے ہیں۔

(چیف ایڈیٹر: ماہنامہ منہاج القرآن)

القرآن

عقیدۂ رسالت اور اطاعتِ رسول ﷺ کی حقیقی معرفت

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا علمی و فکری خصوصی خطاب

حصہ: ۱۵

ترتیب و تدوین: محمد یوسف منہاجین

اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم اور حضور نبی اکرم ﷺ کے حکم کی حجیت کو یکساں اور ایک قرار دینے، مقامِ نبوت و رسالت کی عظمت کو ہمارے اذہان میں جاگزیں کرانے اور قرآن و سنت کے لزوم اور وجوب کو ایک قرار دینے کے لیے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر یہ اسلوب بھی اختیار کیا ہے کہ اپنا اور اپنے حبیب ﷺ کا ذکر کر کے فعل میں تثنیہ کی ضمیر استعمال نہیں کی بلکہ واحد کی ضمیر استعمال کی تاکہ یہ امر واضح ہو جائے کہ حکمِ الٰہی اور حکمِ رسول کا آپس میں وحدت کا تعلق ہے، یہ علیحدہ نہیں بلکہ ایک ہیں اور اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کی حجیت اور اتھارٹی ایک ہے۔ اگر اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے اکٹھے ذکر میں تثنیہ کی ضمیر آتی تو اس کا مطلب تھا کہ یہ دونوں جدا جدا ہیں۔ اسی لیے اللہ نے ہر جگہ واحد کی ضمیر استعمال فرمائی اور واضح کر دیا کہ ہم دونوں جدا نہیں اور ہمارے حکم کی حجیت و اتھارٹی ایک ہی ہے۔

اس سلسلۂ تحریر کے گذشتہ حصہ (شائع شدہ ماہ جون 2025ء) میں ہم اس باب میں چند آیات کریمہ کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ مزید آیات ملاحظہ ہوں:

۱۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ۔ (الأنفال، ۸: ۲۴)

(خطاب نمبر: Ci-37)، (27 دسمبر 2013ء)، (مقام: کینیڈا)

”اے ایمان والو! جب (بھی) رسول (ﷺ) تمہیں کسی کام کے لیے بلائیں جو تمہیں (جاودانی) زندگی عطا کرتا ہے تو اللہ اور رسول (ﷺ) دونوں کی طرف فرمانبرداری کے ساتھ جواب دیتے ہوئے (فوراً) حاضر ہو جایا کرو۔“

آیت کریمہ میں مذکور دَعَاکُمْ کے فعل کا فاعل رسول ہے، اس کا فاعل اللہ نہیں ہے۔ یعنی بلانے والے رسول اللہ ﷺ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اس بلاوے پر لبیک کہنے کی تلقین کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ۔

تو پھر اللہ اور رسول دونوں کی طرف جواب دیتے ہوئے حاضر ہو جایا کرو۔

پس معلوم ہوا کہ جب بلانے والے رسول اللہ ﷺ ہیں تو اُن کے بلاوے پر لبیک کہنا کہ ”میں حاضر ہوں“، یہ لبیک کہنا صرف رسول اللہ ﷺ کے بلاوے پر نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کے بلاوے پر لبیک کہنا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دعاکم میں واحد کی ضمیر استعمال فرمائی تاکہ پتہ چل جائے کہ اللہ کی دعوت اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت ایک ہے۔۔۔ اللہ کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی حجیت ایک ہے۔۔۔ ان میں فرق کرنا اللہ کی منشاء اور قرآن مجید کے حکم کے خلاف بغاوت ہے۔

☆ اس آیت کریمہ کے مفہوم کی مزید واضحیت ہمیں حدیث رسول ﷺ سے بھی میسر آتی ہے۔ حضرت ابو سعید بن معلی فرماتے ہیں:

كُنْتُ أُصَلِّي فِي الْمَسْجِدِ فَدَعَانِي رَسُولُ اللهِ ﷺ فَلَمْ أُجِبْهُ، حَتّٰى صَلَّيْتُ فَأَتَيْتُهُ فَقَالَ مَامَنَعَكَ اَنْ تَاتِيَنِيْ؟ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ إِنِّي كُنْتُ أُصَلِّي، فَقَالَ ﷺ :أَلَمْ يَقُلْ اللهُ تعالیٰ {اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ}

(بخاری، الصحیح، کتاب التفسیر، باب ما جاء فی فاتحۃ الکتاب، ۴:۱۶۲۳، رقم:۴۲۰۴)

میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ آقا علیہ السلام نے مجھے بلایا۔ میں آقا علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر نہ ہوا۔ تیزی سے نماز کو مکمل کیا اور سلام پھیرنے کے بعد آقا علیہ السلام کی بارگاہ میں پہنچا تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: اے ابوسعید! کیا تونے سنا نہیں تھا کہ میں نے تمہیں بلایا تھا؟ میں نے کہا: جی، میں نے سنا تھا لیکن میں نماز میں تھا۔اس پر آقا علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تونے اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نہیں سنا کہ ”جب بھی رسول تمہیں بلائے تو فوری لبیک کہتے ہوئے اللہ اور رسول کی بارگاہ میں حاضر ہو جایا کرو۔“

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا بلانا کسی غیر کا بلانا نہیں ہے، جب رسول اللہ ﷺ بلا رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ کا بلاوا بھی اللہ تعالیٰ کا بلاوا ہے۔ عقیدہ رسالت کو سمجھنے کے لیے اسی تصور کو بنیاد بنانا ہوگا۔ نہ جانے کس تصور نے امت کو عقیدۂ رسالت کی صحیح معرفت سے محروم کر دیا کہ وہ توحید و رسالت اور قرآن وسنت کے باہمی تعلق کو سمجھنے سے قاصر رہی اور گمراہ ہوگئی۔

اس حدیث مبارک کے ذریعے آقا علیہ السلام نے عقیدہ رسالت کے حوالے سے امت کی رہنمائی اور تربیت فرمائی ہے۔ آقا علیہ السلام نے اپنے صحابی کو نماز پڑھتے دیکھنے کے باوجود آواز دی۔ اس سے واضح ہو رہا ہے کہ گویا امتحان لے رہے ہیں اور صرف امتحان ہی نہیں بلکہ اس موقع پر تربیت بھی فرمانا چاہتے ہیں اور ایک نمونہ بھی دینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ نمونہ آقا علیہ السلام اس وقت نہ دیتے تو آج تک امت کو یہ مسئلہ اور قرآن مجید کی اس آیت کی سمجھ نہ آتی اور اس کا حقیقی معنی ہم تک نہ پہنچتا۔ پس آقا علیہ السلام نے عملی طور پر اس آیت کے معنی کو بیان فرما دیا۔

اگر ہم نماز پڑھ رہے ہوں، اور ہمارے پاس سے مفتی اعظم بھی گزریں تو شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم ان کے بلانے پر نماز توڑ کر ان کے پاس آجائیں۔ یہ کسی کا حق نہیں ہے، اس لیے کہ حالتِ نماز میں بندہ اللہ کے حضور پیش ہوتا ہے، وہ اللہ کے دروازے پر ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اللہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے بندے کو

وہاں سے ہٹائے اور اپنے پاس بلائے۔آقا علیہ السلام نے اس تصور کو سمجھانے کے لیے اس صحابی کو آواز دی کہ میرا بلانا عام بندے کا بلانا نہیں ہے بلکہ میرا بلانا اللہ ہی کا بلانا ہے۔ پس اس تصور اور عقیدہ کو سمجھانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس صحابی کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھنے کے باوجود آواز دی اور یہ دیکھنا چاہا کہ وہ میرے بلاوے پر فوری آتا ہے یا نہیں؟

یہ واقعہ چونکہ پہلی بار پیش آرہا تھا، اس لیے وہ صحابی سمجھ نہیں سکتے تھے کہ اس صورت حال میں کیا کیا جائے کہ ایک طرف میں نماز پڑھ رہا ہوں اور دوسری طرف آقا علیہ السلام نے بلایا ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ اگر آقا علیہ السلام کی طرف چلا گیا تو نماز ٹوٹ جائے گی، اس لیے انھوں نے تیزی سے نماز مکمل کی اور پھر حاضر ہوئے۔ آقا علیہ السلام نے سوال کیا کہ فوری کیوں نہیں آئے؟ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم تھا کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا۔اس پر آقا علیہ السلام فرماتے ہیں:

أَلَمْ يَقُلِ اللهُ تعالیٰ: اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ۔

کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ جب بھی رسول تمہیں بلائے تو اللہ اور رسول دونوں کی بارگاہ میں فوری حاضر ہو جایا کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلانے میں حیاتِ جاودانی، حیاتِ روحانی اور حیاتِ ایمانی ہے، جو زندگی تمھیں نماز میں ملتی ہے، وہی زندگی تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلاوے سے ملتی ہے۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیتِ کریمہ کی طرف اس صحابی کو متوجہ فرما کر واضح کر دیا کہ میرا بلانا کسی غیر اللہ کا بلاوا نہیں تھا بلکہ اللہ ہی کا بلاوا تھا۔ تم فوری نماز چھوڑ کر آتے، مجھے لبیک کہتے، میری بات سنتے، مجھے جواب دیتے، مجھ سے ہم کلام ہوتے اور میرا کام کرتے تو تمھاری نماز نہ ٹوٹتی۔ تم میری بات سن کر اور میرے کہے پر عمل کرنے کے بعد وہیں سے نماز شروع کرتے جہاں سے چھوڑی تھی تو نہ نماز ٹوٹتی اور نہ سجدہ سہو کرنا پڑتا۔

معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مشغول رہنا، اللہ کی عبادت میں مشغول رہنا ہے۔ یہ شان کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں ہو سکتی، خواہ وہ خلفائے راشدین ہوں یا صحابہ کرام، اہل بیت اطہار ہوں یا اولیاء کرام، کسی کو یہ شان حاصل نہیں۔ یہ صرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائص میں سے ہے۔

☆ اسی موضوع سے متعلقہ ایک اور حدیث مبارک ملاحظہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

خَرَجَ رَسُولُ اللهِ عَلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ وَهُوَ يُصَلِّي، فَقَالَ: يَا أُبَيُّ فَالْتَفَتَ ابی فَلَمْ يُجِبْهُ، ثُمَّ صَلَّى أُبَيٌّ فَخَفَّفَ، ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى رَسُولِ اللهِ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكَ يا رَسُولَ اللهِ، قَالَ: وَعَلَيْكَ السَّلام قَالَ: مَا مَنَعَكَ يا أُبَيُّ إِذْ دَعَوْتُكَ أَنْ تُجِيبَنِي قَالَ: أَيْ رَسُولَ اللهِ انی كُنْتُ فِي الصَّلَاةِ۔ قَالَ: أَفَلَمْ تَجِدْ فِيمَا أَوْحَى اللهُ إِلَيَّ أَنْ {اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ} قَالَ: بَلَى يا رَسُولَ اللهِ و لَا أَعُودُ ان شاء اللہ۔ (سنن ترمذی، کتاب فضائل القرآن، رقم: ۲۸۸۴)

آقا ﷺ ابی بن کعب کی تلاش میں نکلے، ان کے پاس تشریف لائے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ آقا ﷺ نے فرمایا: اے ابی بن کعب! ابی بن کعب نے آقا ﷺ کی زبان مبارک سے اپنا نام سن کر اپنا چہرہ اس حالت میں آقا ﷺ کی طرف کر دیا کہ ان کے ہاتھ حالتِ نماز کی طرح بندھے ہوئے تھے۔ اب انھیں یہ پتہ نہیں تھا کہ کیا کروں، ان کے ساتھ پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا تھا، اس لیے انھوں نے اپنا چہرہ تو آپ ﷺ کی طرف کر دیا مگر کوئی کلام نہ کیا اور آپ ﷺ کو کوئی جواب نہ دیا۔

پھر انھوں نے تیزی سے نماز مکمل کی اور آقا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ آقا ﷺ نے ابی بن کعب کو جواب دیا اور فرمایا: اے ابی بن کعب! جب میں نے بلایا تھا تو آپ کو کس چیز نے مجھے جواب دینے سے روکا؟ وہ جواب دیتے ہیں: یا رسول اللہ! میں نماز میں تھا۔ آقا ﷺ نے فرمایا: اے ابی بن کعب! کیا اللہ کی وحی اور قرآن میں تم یہ حکم نہیں پاتے کہ اللہ نے فرمایا کہ جب بھی تمھیں رسول آواز دے تو لبیک کرتے ہوئے اللہ اور اللہ کے رسول کی بارگاہ میں حاضر ہو جایا کرو۔ میری بارگاہ میں فوراً حاضر ہونا یہ اللہ اور اللہ کی رسول کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ یہ فقط میری طرف آنا نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی طرف آنا ہے۔ نماز میں بھی تم اللہ کی عبادت میں تھے اور اگر میری آواز پر لبیک کہتے ہوئے میرے پاس آجاتے تو تمھارا یہ عمل بھی اللہ کی عبادت ہی متصور ہوتا۔

حضرت ابی بن کعب ؓ کے ادب کا عالم دیکھئے کہ حالتِ نماز میں ہی اپنا چہرہ آقا ﷺ کی طرف کر دیا۔ اگر آج ہمارے زمانے کا کوئی فرد ہوتا جو علم اور توحید کا بڑا علمبردار ہوتا تو شاید مڑ کر بھی نہ دیکھتا، کھڑا رہتا اور کہتا کہ حضور ﷺ خود دیکھ لیں گے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں۔ صحابہ کرام کو اگرچہ اس وقت تک مسئلہ کی سمجھ نہیں تھی مگر ان کے اندر ذاتِ مصطفی ﷺ کا ادب واحترام اور شانِ رسالت کی بلندی کا فہم موجود تھا۔ اندازہ کریں کہ حضرت ابی بن کعب ؓ نماز میں کھڑے ہیں مگر اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ آقا ﷺ کے بلانے

کے باوجود اپنا چہرہ قبلہ کی طرف کر کے کھڑے رہیں۔ انھوں نے فوراً آقا علیہ السلام کی طرف اپنا چہرہ موڑ لیا اور ہاتھ حالتِ نماز کی طرح باندھے رکھے تا کہ آقا علیہ السلام کو پتہ چل جائے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی ہمیں آواز دے اور ہم اس کی طرف مڑ کر دیکھ لیں، بے شک جواب نہ دیں تو کیا نماز باقی رہتی ہے؟ نہیں، بلکہ ٹوٹ جاتی ہے، اس لیے کہ قبلہ رخ سے دائیں یا بائیں جانب پھرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس فقہی مسئلہ سے تو آشنا ہوں گے کہ اگر چہرہ رخِ کعبہ سے مڑ گیا تو نماز ٹوٹ جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ حضور علیہ السلام کی طرف چہرہ مڑ جانے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ اس لیے کہ اگر ان کا یہ عقیدہ ہوتا کہ نماز ٹوٹ جاتی ہے تو پھر حضرت ابی بن کعب اپنا چہرہ آقا علیہ السلام کی طرف پھیرنے کے بعد خاموش نہ رہتے، بلکہ باتیں بھی شروع کر دیتے کہ نماز تو پہلے ہی رخ کعبہ سے پھرنے کے سبب ٹوٹ گئی ہے۔ اگر وہ یہ سمجھتے کہ آقا علیہ السلام کی طرف مڑ کر دیکھ لینے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے تو پھر باتیں بھی شروع کر دیتے۔ مگر یہ اُن کا عقیدہ نہ تھا۔ اُن کا عقیدہ تو یہ تھا کہ چہرہ کعبہ کی طرف سے ہٹا کر مصطفی کی طرف کر دیا جائے تو نماز نہیں ٹوٹتی۔ وہ اللہ کی طرف رخ کرنے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رخ کرنے کو ایک ہی طرف رخ کرنا سمجھتے تھے۔

پس حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اپنا چہرہ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پھرنے کے باوجود خاموش اس لیے رہے کہ انھیں اس کے بعد مسئلہ کی سمجھ نہیں تھی کہ اب کیا کرنا ہے؟ اس لیے نماز مکمل کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا حکم اللہ نے دیا ہے اور اللہ کے ہر حکم کی اطاعت بجالانا عبادت ہے

یاد رکھیں! اللہ کی عبادت صرف رکوع، قیام اور سجود نہیں ہے بلکہ آقا علیہ السلام کے حکم کی اطاعت بھی اللہ کی عبادت ہے۔۔۔ آقا علیہ السلام کی محبت بھی اللہ کی عبادت ہے۔۔۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر سنت پر عمل کرنا بھی اللہ کی عبادت ہے۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر چلنا بھی اللہ کی عبادت ہے، اس لیے کہ یہ اللہ ہی کا حکم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ پر چلو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو۔ پس اللہ کے حکم کی اطاعت بجا لانا بھی اللہ کی عبادت ہے۔

جس طرح والدین کی فرمانبرداری کرنا بھی اللہ کی عبادت ہے، کیونکہ والدین کے ساتھ نیکی کا حکم اللہ نے دیا ہے۔۔۔رزقِ حلال کمانا اور رزقِ حرام سے بچنا بھی اللہ کی عبادت ہے، حالانکہ یہ سجدہ، رکوع ، قیام اور تلاوت نہیں ہے مگر رزقِ حلال کے لیے محنت چونکہ اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں، اس لیے یہ بھی اللہ کی عبادت ہے۔۔۔علم کے حصول کے لیے سفر کرنا بھی اللہ کی عبادت ہے کیونکہ اللہ نے حصولِ علم کا حکم دیا ہے۔۔۔ کسی کو اس نیت سے کھانا کھلانا کہ یہ اللہ کا حکم ہے تو یہ بھی اللہ کی عبادت ہے۔۔۔ الغرض غریب کی مدد کرنا، یتیم کی کفالت کرنا، جہاد پر جانا، پڑوسی کو کھانا بھیجنا، بے روزگار کی مدد کر دینا، غریب کو کھانا دینا، یتیموں اور غریبوں کا سہارا بن جانا، مسکراہٹ سے کسی سے ملنا، دل جوئی کرنا، بھلائی کے کام کرنا، لوگوں کو عزت دینا، مہمانوں کو عزت کے ساتھ اپنے ہاں بٹھانا، ملتے ہوئے السلام علیکم کہنا، سلام کا جواب محبت سے دینا، رشتے داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ بھلائی کرنا، غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اور اپنے وعدے ایفا کرنا، یہ سب عبادت ہے، اس لیے کہ اللہ نے ان امور کو بجالانے کا حکم دیا ہے اور اللہ کے ہر حکم کی صدقِ نیت سے تعمیل کرنا، اللہ کی عبادت ہے۔

اسی طرح اللہ کا حکم ہے کہ رسول کی اطاعت کرو، پس رسول کے حکم کی اطاعت کی نیت سے کوئی بھی کام کرنا عبادت کہلائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ۔ (الأنفال، ۸: ۲۴)

یعنی تمہارے قلوب و ارواح کی زندگی رسول اللہ ﷺ کے بلاوے میں ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے بلاوے میں روحانی اور ایمانی زندگی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہمارے ایمان کو زندہ کرتا ہے۔۔۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کرنا اور اسے واجب و لازم جاننا، ہماری حیاتِ ایمانی ہے۔۔۔ اور اس کا انکار کرنا ہمارے ایمان کی موت ہے۔ وہ لوگ جو حجیتِ حدیث و سنت کا انکار کرتے ہیں وہ دراصل اپنی ایمانی موت سے ہمکنار ہو رہے ہیں۔

امام قرطبیؒ نے اس حدیث مبارک کے حوالے سے امام شافعی کا قول درج کیا ہے کہ امام شافعی فرماتے ہیں:

هذا دليل على أن الفعل الفرض أو القول الفرض إذا أتى به في الصلاة لا تبطل، لأمر رسول الله بالإجابة وإن كان في الصلاة۔ (قرطبی، جامع لأحکام القرآن، ۹: ۴۸۴)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نماز کی حالت میں آقا علیہ السلام کا حکم سننا کہ میرے پاس آؤ اور اس آواز پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فوراً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو جانا، اس عمل سے ان کی نماز باطل نہیں ہوتی تھی۔ وہ نماز چھوڑ کر حضور نبی اکرم ﷺ کے تفویض کردہ کام کر کے آتے اور پھر وہیں سے نماز پڑھنا شروع کر دیتے جہاں سے چھوڑ کر گئے تھے۔

۲۔ قرآن مجید کے وہ مقامات جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام اکٹھا ذکر کیا مگر دونوں کے لیے تثنیہ کی بجائے واحد کی ضمیر استعمال کی، اُن آیات میں سے ایک اور آیت ملاحظہ ہو: اللہ رب العزت نے فرمایا:

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ۔ (التوبۃ، ۹: ۶۲)

اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) زیادہ حقدار ہے کہ وہ اسے راضی کریں۔

سوال یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں کس کو راضی کرنے کی بات کی جارہی ہے۔ اللہ کو یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو؟ اس لیے کہ بات تو دو کی ہو رہی ہے مگر ضمیر واحد کی استعمال ہوئی ہے۔ عام قاعدہ کی رو سے تو تثنیہ کی ضمیر استعمال ہونی چاہیے تھی اور یہ کہا جاتا: اَنْ يُّرْضُوْهُمَا کہ اُن لوگوں پر ایمانی ذمہ داری ہے کہ اللہ اور اس کے رسول دونوں کو راضی کریں۔ یہاں یہ نہیں فرمایا بلکہ فرمایا: اَنْ يُّرْضُوْهُ (اُس کو راضی کریں۔) آیت کی ابتداء میں نام اللہ اور رسول دونوں کا آیا مگر واحد کی ضمیر اس لیے استعمال کی تاکہ واضح کر دیا جائے کہ رضائے رسول ہی رضائے الٰہی ہے اور رضائے رسول، رضائے الٰہی سے مختلف نہیں۔ جیسے اطاعتِ رسول، اطاعتِ الٰہی سے جدا نہیں۔۔۔ جیسے محبتِ رسول، محبتِ الٰہی سے جدا نہیں۔۔۔ جیسے معصیتِ رسول، اللہ کی معصیت سے جدا نہیں۔۔۔ جیسے حدِ رسول کا حکم، اللہ کی حد کے حکم سے جدا نہیں۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا، اللہ ہی کی رضا ہے، یہ آپس میں جدا نہیں۔۔۔ اسی طرح رسول کی بیعت اللہ کی بیعت سے جدا نہیں، جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کر رہے ہیں، وہ اللہ ہی کی بیعت کر رہے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ (الفتح، ۴۸: ۱۰)

اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو لوگ آپ کے دستِ اقدس پر بیعت کرتے ہیں، انھیں کوئی اور مغالطہ نہ لگے، انھیں معلوم ہو کہ وہ اللہ ہی کی بیعت کر رہے ہیں۔ پھر مزید تصریح کرتے ہوئے فرمایا: ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ یعنی بیعت کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ کو محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ نہ جانو بلکہ اللہ کا ہاتھ جانو۔

۳۔ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر اللہ نے اپنا اور اپنے رسول کا ذکر اکٹھا کیا مگر ضمیر واحد کی استعمال کی۔ ارشاد فرمایا:

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ۔

''انہیں اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے اپنے فضل سے غنی کر دیا تھا۔'' (التوبۃ، ۹: ۷۴)

اس آیت کریمہ میں غنی کرنے کا فعل صرف اللہ کی طرف نہیں بلکہ اللہ کے رسول کی طرف بھی ہے، اس لیے قاعدہ کے اعتبار میں من فضلھما ہونا چاہیے تھا کہ اللہ اور اس کے رسول دونوں نے اپنے فضل سے غنی کیا مگر اللہ رب العزت نے تثنیہ کی ضمیر وارد نہ کر کے اس دوئی کی جڑ کاٹ دی اور واضح کر دیا کہ غنی کرنے کے عمل میں بھی اللہ اور رسول کا غنا ایک ہے اور فضل کے معاملے میں بھی دونوں کا فضل ایک ہے۔ رسول کا فضل فرمانا بھی اللہ ہی کا فضل فرمانا ہے۔

آج ہم اتنی بات بھی کہنے سے ڈرتے ہیں کہ ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے غنی کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کا ہم پر فضل ہے۔'' اس لیے کے ہمارے تصورات واضح نہیں رہے۔ غنی کرنے میں اللہ کے نام کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا نام ملا دیا تو سوچتے ہیں کہ کہیں شرک نہ ہو جائے۔ افسوس کہ ہم نے توحید کو سمجھا ہی نہیں اور ہم جانتے ہی نہیں کہ شرک کی حدود کیا ہیں؟ ہم نے توحید کو شرک بنا دیا ہے اور توحید کے اندر شرک کی آمیزش کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے انھیں اپنے فضل سے غنی کیا تھا۔

۴۔ قرآن مجید میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ دونوں کا ذکر فعل کی ضمیر واحد کے ساتھ ہونے کے حوالے سے ایک اور آیت کریمہ ملاحظہ ہو۔ ارشاد فرمایا:

اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ۔ (النور، ۲۴: ۵۱)

''جب انہیں اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول دونوں کی طرف بلانے کی بات ہے مگر جب فیصلہ کرنے کے بارے میں واضحیت دی تو فعل لِيَحْكُمَ واحد کی ضمیر استعمال کی کہ وہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ یہاں بھی قاعدہ کے مطابق واحد کی ضمیر نہیں بلکہ تثنیہ کی ضمیر ہونی چاہیے تھی اور یوں کہا جاتا کہ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَا کہ وہ دونوں (اللہ اور رسول) ان کے

درمیان فیصلہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا بلکہ فرمایا: لِيَحْكُمَ وہ فیصلہ کردے۔ اس اسلوب سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ یہاں ضمیر کا مرجع صرف رسول کی ذات ہے حالانکہ دعوت الی اللہ بھی ہے اور الی الرسول بھی ہے۔ پس اللہ کا حکم اور رسول کا حکم ایک ہے۔ رسول کے حکم پر لبیک کہنا اسی طرح ہے جیسے اللہ کی طرف دعوت پر لبیک کہنا۔

☆ اسی بات کو سورۃ النساء میں بھی بیان کیا گیا۔ ارشاد فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

”پس (اے حبیب!) آپ کے رب کی قسم یہ لوگ مسلمان نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ وہ اپنے درمیان واقع ہونے والے ہر اختلاف میں آپ کو حاکم بنالیں۔ پھر اس فیصلہ سے جو آپ صادر فرما دیں اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور (آپ کے حکم کو) بخوشی پوری فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں۔“ (النساء، ۴: ۶۵)

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اختلاف کی صورت میں اللہ اور رسول کو حاکم بنائے بلکہ فرمایا میرے حبیب ﷺ جب تک آپ ﷺ کو حاکم نہ بنائے، اس وقت تک یہ صاحبِ ایمان ہی نہیں ہوسکتا۔

اختلاف کی صورت میں کس کی طرف رجوع کریں؟

اس موقع پر ایک اشکال کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات ہمارے مذکورہ بالا موقف (کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے درمیان اختلاف کی صورت میں حاکم مانا جائے) کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (یوسف، ۱۲: ۴۰)

”حکم کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ۔ (الشوریٰ، ۴۲: ۱۰)

”اور تم جس امر میں اختلاف کرتے ہو تو اُس کا فیصلہ اللہ ہی کی طرف (سے) ہوگا۔“

اب ہم اختلاف کی صورت میں کس کی طرف جائیں؟ اللہ کی طرف یا رسول اللہ ﷺ کی طرف؟ اس لیے کہ ان آیات میں تو صریحاً اللہ کی طرف جانے کا حکم دیا جارہا ہے۔

اس حوالے سے یہ بات ذہن نشین رہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کی نفی نہیں کرتی اور نہ ہی قرآن کا ایک حکم دوسرے حکم کے مخالف ہے بلکہ ہر آیت دوسری آیت کی تائید کرتی ہے یا اس کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ ٹکراؤ اور تضاد ہمیں اپنی ناقص عقل کے باعث نظر آتا ہے۔ ہم نے اپنی سوچ کو قرآن اور دینِ اسلام پر حاوی کر رکھا ہے اور قرآنی تعلیمات کو اپنی سوچ اور اپنے فہم کے مطابق موڑنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم ایسی سوچ رکھیں گے تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارے فہم پر شیطان حاکم ہے۔ اگر ہم اپنی سوچ کو قرآن کے تابع کر دیں تو قرآن نے تو ہر چیز کھول کھول کر سمجھا دی۔ مذکورہ التباس اور اشکال بھی قرآن مجید کے مطالعہ سے دور ہو جاتا ہے۔

اختلاف کی صورت میں کس کی طرف رجوع کرنا ہے، اس حوالے سے قرآن مجید میں تین طرح کی آیات ہیں:

۱۔ کچھ آیات میں فرمایا کہ اختلاف کی صورت میں حکم اللہ کا ہو گا۔ مثلاً: ارشاد فرمایا:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللهِ۔ (الشوریٰ، ۴۲: ۱۰)

”اور تم جس امر میں اختلاف کرتے ہو تو اُس کا فیصلہ اللہ ہی کی طرف (سے) ہو گا۔“

۲۔ کچھ آیات میں فرمایا کہ اختلاف کی صورت میں حکم رسول کا ہو گا۔

مثلاً: ارشاد فرمایا:

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرٰكَ اللهُ۔

”(اے رسولِ گرامی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف حق پر مبنی کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں میں اس (حق) کے مطابق فیصلہ فرمائیں جو اللہ نے آپ کو دکھایا ہے۔“ (النساء۴: ۱۰۵)

۳۔ کچھ آیات میں فرمایا کہ اختلاف کی صورت میں حکم اللہ اور اس کے رسول کا ہو گا۔ مثلاً: ارشاد فرمایا:

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ۔ (النساء، ۴: ۵۹)

” پھر اگر کسی مسئلہ میں تم باہم اختلاف کرو تو اسے (حتمی فیصلہ کے لیے) اللہ اور رسول (ﷺ) کی طرف لوٹا دو۔“

ان تین طرح کی آیات میں تضاد نہیں بلکہ اسے ایک ہی حقیقت کے تین روپ تصور کیا جائے گا۔ جب ہم اس راز کو سمجھ جائیں گے کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا حکم ایک ہی حکم ہے تو پھر ہمیں ان آیات میں کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا۔ (اس سلسلہ وار تحریر کے گزشتہ چودہ

حصوں میں بیسیوں آیات کریمہ اس موضوع پر بیان کی جاچکی ہیں)

پس حکم اللہ کا ہو تب بھی وہ رسول کا حکم ہوگا۔۔۔حکم رسول کا ہو تب بھی وہ اللہ اور رسول کا حکم ہوگا۔۔۔اور حکم اللہ اور رسول دونوں کا لکھا جائے تب بھی وہ ایک ہی حکم ہوگا۔ ہم اسے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے، جو ایسا کرے گا وہ قرآن کی مخالفت کرے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت: منافقین کا شیوہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کو منافقین کا شیوہ قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ (النور، ۲۴: ۴۸)

”اور جب ان لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ فرما دے تو اس وقت ان میں سے ایک گروہ (دربارِ رسالت میں آنے سے) گریزاں ہوتا ہے۔“

دربارِ رسالت میں آنے سے گریزاں رہنے والا یہ گروہ منافقین کا تھا۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کو نہ ماننے والوں کو قرآن مجید نے منافقین کہا ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی طرف فیصلہ کے لیے آنے والوں کو حق پر ہونے والا قرار دیا کہ حق والے ہی حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف آتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ۔ (النور، ۲۴: ۴۹)

”اور اگر وہ حق والے ہوتے تو وہ اس (رسول ﷺ) کی طرف مطیع ہو کر تیزی سے چلے آتے۔“

یعنی اگر وہ لوگ حق پر ہوتے اور انھیں پتہ ہوتا کہ ہم حق پر ہیں اور فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا تو وہ دائیں بائیں نہ دیکھتے اور اعراض نہ کرتے۔ اس آیت میں بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ دونوں کا ذکر ہے مگر اِلَيْهِ ضمیر واحد کی بیان فرمائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی طرف جانے میں اللہ اور رسول دونوں کی طرف جانا شامل ہے اور جو لوگ اس میں فرق کرتے ہیں، وہ منافقین ہیں۔

اس بات کو دوسرے مقام پر یوں واضح فرمایا:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا۔ (النساء۴: ۶۱)

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ (قرآن) کی طرف اور رسول(ﷺ) کی طرف آجاؤ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ (کی طرف رجوع کرنے) سے گریزاں رہتے ہیں۔“

اس آیت مبارکہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ جب انھیں قرآن کی طرف بلایا جاتا ہے اور پھر ساتھ ہی رسول کی طرف بھی بلایا جاتا ہے تو منافق اللہ اور قرآن کی طرف جانے سے نہیں گھبراتے لیکن جب رسول اللہ ﷺ کی بات آتی ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف آنے سے کتراتے ہیں اور آپ ﷺ کے حکم کو حجت ماننے سے گھبراتے ہیں۔ پس جو شخص قرآن کو تو حجت مانے مگر رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو حجت نہ مانے ، ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن نے فتویٰ دے دیا کہ وہ منافق ہیں، ان کا اہلِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

آیت مبارکہ میں اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ یَصُدُّوْنَ عَنِّی کہ وہ میرے پاس آنے سے گھبراتے ہیں بلکہ فرمایا یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا میرے حبیب ﷺ! آپ کی بارگاہ میں آنے اور آپ ﷺ کے حکم کو حجت مان کر حاضر ہونے سے کتراتے ہیں۔ لہٰذا جو فقط قرآن کو حجت ماننے کی بات کرے اور حکمِ رسول کو حجت نہ مانے، قرآن نے اسے منافق قرار دیا۔اب یہ فیصلہ ہمارے اپنے پاس ہے کہ ہم قرآن کی اصطلاح کے مطابق منافق بننا چاہتے ہیں یا مومن بننا چاہتے ہیں؟ قرآن نے کہا کہ اگر مومن بننا ہے تو پھر سر جھکا کر اور پیکرِ اطاعت بن کر حکمِ رسول کی طرف آجاؤ اور حضور علیہ السلام کے فرمان کو قرآن کے فرمان کی طرح سمجھو۔اس لیے کہ جو قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی حجیت میں فرق کرے،وہ قرآن کی رو سے منافق ہے۔

(جاری ہے)

الفقہ: آپ کے فقہی مسائل

دارالافتاء تحریک منہاج القرآن، زیرِ نگرانی: مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی

سوال: عشرہ محرم الحرام میں شادی کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: امام حسین علیہ السلام اور آپ کے رفقاء کی شہادت کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اسلام کا دامن شہادت کے پھولوں سے لبریز ہے مگر کلمہ گو ظالم شیطانوں کے ہاتھوں جس ظالمانہ انداز میں گلشنِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھول مَسلے گئے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ اس قدر دردناک شہادت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف اس کے وقوع پذیر ہونے کی خبر دی بلکہ چشمانِ مقدس سے آنسو بہا کر غمِ حسین علیہ السلام میں رونا اپنی سنت بنا دیا۔

امت کی اکثریت نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور آپ کے رفقاء علیہم السلام کی شہادت کو ایک عظیم سانحہ کے طور پر دیکھا اور یوم عاشورہ یعنی 10 محرم الحرام کو یوم الحزن کے طور پر یاد کیا۔ اس لیے امتِ مسلمہ کے ہاں عشرہ محرم الحرام میں شادیوں یا خوشیوں کی دیگر تقریبات کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ البتہ مجبوری کی صورت میں سادگی کے ساتھ نکاح کرنے میں حرج نہیں۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر خانوادہ رسالت کے شہدائے پر ہونے والے مظالم پر خوشیاں مناتا ہے اور اسی لیے عشرہ محرم میں خوشیوں کی تقریبات کا انعقاد کرتا ہے تو وہ یقیناً روحِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا دینے کا مرتکب ہے اور اسے بروزِ قیامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامنا کرنے

کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ امت میں ایسے بدبخت گروہ بھی گزر چکے ہیں جو شہادتِ امامِ عالی مقام کی مناسبت سے عاشورہ کے روز باقاعدہ خوشیوں اور عید کا اہتمام کرتے۔ امام ابن کثیر (البدایہ والنھایہ، ۱۱: ۵۷۷) رقمطراز ہیں:

’شام کے ناصبیین نے (سانحہ کربلا کے بعد) یوم عاشورہ کو اس طرح منانا شروع کیا کہ یہ لوگ یوم عاشورہ کو کھانے پکاتے، غسل کرتے، خوشبو لگاتے اور قیمتی لباس پہنتے اور اس دن کو عید کے طور پر مناتے اور خوشی و مسرت کا اظہار کرتے۔ انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے قتل کی تاویل یہ کی کہ وہ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے نکلے تھے اور جس شخص کی بیعت پر لوگوں نے اتفاق کیا تھا، اسے معزول کرنے آئے تھے (معاذ اللہ)۔

ابنِ کثیر خلاصہ کلام ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ آپ علیہ السلام کی شہادت پر غمگیں ہو۔ بلاشبہ آپ سادات مسلمین اور علماء صحابہ میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس بیٹی کے صاحبزادے ہیں جو آپ کی بیٹیوں میں سب سے افضل تھیں۔ آپ عبادت گزار، دلیر اور سخی تھے۔

سوال: بیٹی کے نکاح کے لیے شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں کیسا لڑکا تلاش کرنا چاہیے؟

جواب: اسلامی شریعت کے مطابق رشتہ طے کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ لڑکے اور لڑکی کے قد کاٹھ، شکل و صورت، تعلیم و تربیت میں ہر ممکن حد تک مناسبت پائی جائے تاکہ دونوں میں ہم آہنگی، مطابقت و موافقت اور الفت قائم ہو سکے۔ بے جوڑ اور غیر مناسب رشتوں سے بچا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ.

”تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے پسندیدہ اور حلال ہوں۔“ (النساء، ۴: ۳)

اس آیت مبارکہ کے مطابق پسندیدگی دو طرفہ ہے، صرف لڑکے کو لڑکی پسند ہونا کافی نہیں ہے بلکہ لڑکی کو بھی لڑکا پسند ہونا ضروری ہے، پھر ہی دونوں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ شادی کے مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ دونوں میں محبت و مودت ہو اور ایک دوسرے سے سکون پائیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ. (الروم، ۳۰: ۲۱)

”اور یہ (بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان کی طرف سکون پاؤ اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی، بے شک اس (نظامِ تخلیق) میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔“

انتخابِ زوج کے لیے یہ بنیادی چیزیں ہیں جنہیں نظر انداز کر کے اکثر لوگ لڑکے کے مال و دولت کو دیکھ کر لڑکیوں کی زندگیاں برباد کر بیٹھتے ہیں۔ اگر لڑکے کے پاس زیادہ مال و دولت کی بجائے ضروریات زندگی پوری کرنے کی استطاعت اور اچھا کردار ہو تو دونوں کی زندگی میں محبت و سکون اور اللہ تعالیٰ کی رحمت جیسی نعمتیں بآسانی نازل ہو سکتی ہیں اور اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا جَاءَكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ أَمَانَتَهُ وَخُلُقَهُ فَأَنْكِحُوهُ كَائِنًا مَنْ كَانَ، فَإِنْ لَا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ، أَوْ قَالَ: عَرِيضٌ.

جب تمہارے پاس ایسے شخص کے نکاح کا پیغام آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمہیں پسند ہوں تو اس سے نکاح کر دو خواہ وہ کوئی بھی شخص ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زمین میں بہت زیادہ فساد اور فتنہ پھیلے گا۔ (عبد الرزاق، المصنف، ۶: ۱۵۲، رقم: ۱۰۳۲۵)

☆ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا خَطَبَ اِلَيْكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِيْنَه وَخُلُقه فَزَوِّجُوْا اِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِيْضٌ.

جب تمہیں ایسا شخص نکاح کا پیغام دے جس کا دین و اخلاق تمہیں پسند ہو تو اس سے نکاح کر دو، اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں بہت بڑا فتنہ برپا ہو گا۔ (ترمذي، السنن، کتاب النکاح، باب ما جاء إذا جاء کم من ترضون دینہ فزوجوه، ۳: ۳۹۴، رقم: ۱۰۸۴)

حدیث مبارک میں ہے کہ اچھا شوہر وہی ہو گا جو ذیل میں مذکور جملہ امور پر عمل کرنے والا ہو گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَنْ يُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمَ وَأَنْ يَكْسُوهَا إِذَا اكْتَسَى وَلَا يَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا يُقَبِّحْ وَلَا يَهْجُرْ إِلَّا فِي الْبَيْتِ.

جب خود کھائے تو اسے بھی کھلائے، جب خود پہنے تو اسے بھی پہنائے۔ اس کے منہ پر نہ مارے، اسے برا نہ کہے اور گھر کے علاوہ تنہا کہیں نہ چھوڑے۔ (ابن ماجہ، السنن، کتاب النکاح، باب حق المرأة علی الزوج، ۲: ۴۱۷، رقم: ۱۸۵۰)

لہٰذا بہترین انتخاب زوج کے لئے معیار یہ ہونا چاہیے کہ بندہ دین دار، با اخلاق اور وسیع النظر ہو اور اہل خانہ کو نیکی کی رغبت دلانے والا، حلال رزق کمانے والا اور اپنے خاندان یعنی بیوی اور بچوں کی کفالت کا اہل ہو۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ. (مسلم، الصحیح، کتاب النکاح، ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فإنہ له وجاء، ۲: ۱۰۱۹، رقم: ۱۴۰۰)

اے نوجوانو! تم میں سے جو شخص گھر بسانے کی استطاعت رکھتا ہو وہ شادی کرلے کیونکہ نکاح سے نظر بہکتی نہیں اور شرمگاہ محفوظ رہتی ہے، اور جو شخص نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ روزے رکھے کیونکہ روزے اس کی شہوت کو کم کردیتے ہیں۔

علاوہ ازیں مرد کو حلیم الطبع، بہادر، خوش خلق، عورت سے بھلائی کرنے والا، اچھے کاموں سے محبت والا خصوصاً بیوی کے اچھے کاموں پر دل کھول کر داد دینے والا، احسان کرنے والا، ظلم و تشدد سے پرہیز کرنے والا اور معاملاتِ زندگی میں بہترین منظم اور معاشی لحاظ سے خود کفیل ہونا چاہیے۔

سوال: عدالتی نکاح (COURT MARRIAGE) کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: بالغ لڑکا، لڑکی اپنی پسند اور مرضی سے دستور کے مطابق نکاح کر سکتے ہیں۔ یہ حق ان کو قرآن و حدیث اور تقریباً ہر ملکی قانون نے دیا ہے مگر ہمارے سماج نے نہ دیا یہی وجہ کورٹ میرج میں اضافے کا سبب بھی ہے۔ دورِ حاضر میں مسلمانوں کی، اسلامی تعلیمات سے دوری جہاں معاشرے میں دیگر خرابیوں کا باعث بن رہی ہے ان میں ایک خرابی یہ بھی سر فہرست ہے کہ اکثر والدین بچوں کی پسند و ناپسند کو نظر انداز کر کے اپنی مرضی اور پسند کے رشتے طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر لڑکے لڑکیاں والدین کو بتائے بغیر اپنی پسند اور مرضی کے مطابق عدالتی نکاح کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر دوسری طرف والدین اپنی مرضی کے خلاف کی گئی شادی کو قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے حالانکہ جس جوڑے نے آپس میں مل جل کر رہنا ہے، اگر وہ رضامند ہوں تو ان کو زندگی گزارنے کا حق دینا چاہیے جبکہ قرآن و حدیث میں بھی پسند کی شادی کرنے کا حکم ہے۔ لیکن لاعلمی و جہالت کی وجہ سے معاشرے میں لڑکی اور لڑکے کی آپس میں پسند کی شادی کو عجیب سمجھا جاتا ہے اگر وہ بذریعہ عدالت نکاح کرلیں تو مزید نفرت کی نگاح سے دیکھتے ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ. (النساء، ۴: ۳)

”اپنی پسند کی عورتوں سے نکاح کرو۔“

یہ پسند دو طرفہ ہوگی، لڑکے کی طرف سے بھی اور لڑکی کی طرف سے بھی، کسی پر اس کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُنْكَحُ الْأَيِّمُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ وَكَيْفَ إِذْنُهَا قَالَ أَنْ تَسْكُتَ.

بیوہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح بھی اس کی اجازت کے بغیر نہ

کیا جائے۔ لوگوں نے عرض کی: یاسول اللہ! کنواری کی اجازت کیسے معلوم ہوتی ہے؟ فرمایا: اگر پوچھنے پر وہ خاموش ہو جائے تو یہ بھی اجازت ہے۔ (بخاري، الصحيح، ۵: ۹۷۴، رقم: ۴۸۴۳)

فقہائے کرام فرماتے ہیں:

ينعقد نكاح الحرة العاقلة البالغة برضاها وان لم يعقد عليها ولی بكرا كانت أو ثيبا... ولا يجوز للولی اجبار البكر البالغة على النكاح.

آزاد، عقل مند بالغ لڑکی کا نکاح اس کی رضامندی سے ہو جاتا ہے، خواہ اس کا ولی نہ کرے، کنواری ہو یا ثیبہ۔۔۔ ولی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ کنواری بالغ لڑکی کو نکاح پر مجبور کرے۔

(مرغيناني، الهداية شرح البداية، ۱: ۱۹۶)

ولی یعنی باپ یا دادا کے کیے ہوئے نکاح کے بارے میں بیان کرتے ہیں: واذا أدركت بالحيض لا بأس بأن تختار نفسها مع رؤية الدم.

اگر لڑکی حیض کے ذریعے بالغ ہوئی تو خون دیکھتے ہی اسے اختیار حاصل ہو گیا خواہ بچپن کے نکاح کو برقرار رکھے یا رد کر دے۔ (الشيخ نظام وجماعة من علماء الهند، الفتاوى الهندية، ۱: ۲۸۶)

مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ عاقل و بالغ لڑکا اور لڑکی بدستور اپنی پسند اور مرضی سے بعوض حق مہر اور دو مسلمان عاقل و بالغ گواہوں کی موجودگی میں جہاں چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ لہٰذا لڑکا اور لڑکی اپنی مرضی سے عدالتی نکاح کریں تو شرعی طور پر نکاح جائز و درست ہو گا۔

عدالت میں نکاح کرنا بنیادی طور پر کوئی بری بات نہیں ہے۔ اصل خرابی کی جڑ والدین کا لڑکے اور لڑکی کی پسند و ناپسند کو نظر انداز کرنا ہے۔ اکثر والدین مال و دولت اور جائیداد کے لالچ میں شرعی کفو کا خیال نہیں رکھتے بغیر سوچے سمجھے بچوں کی زندگی کا سودا کر دیتے ہیں۔ اُن کا یہ فیصلہ بعد میں ناخوشگوار زندگی کا باعث بنتا ہے۔ اگر کوئی جوڑا اپنی پسند اور رضامندی سے بذریعہ عدالت نکاح کر کے جائز و حلال تعلقات قائم کرتا ہے تو اُس کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق ملنا چاہیے۔ اگر یہ راستہ بھی بند کر دیا جائے تو اس کا مطلب ہے ہم اُن کو غلط کاری پر مجبور کرنے جا رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنی سوچیں اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے تاکہ شادی بیاہ کے معاملات میں بھی والدین اور بچے اپنی اپنی حدود میں رہ کر اچھا فیصلہ کر سکیں اور طے پانے والا رشتہ دنیا و آخرت میں راحت و سکون کا باعث بنے۔ جبکہ عدالتی نکاح پر پابندی لگانا، اس مسئلہ کا حل نہیں ہے

شانِ اہلِ بیت اطہار علیہم السلام

پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کَلِمَةً طَیِّبَةً کَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ۔ تُؤْتِیْٓ اُکُلَهَا کُلَّ حِیْنٍ م بِاِذْنِ رَبِّهَا وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ۔

(ابراہیم، ۱۴: ۲۴، ۲۵)

”کیا آپ نے نہیں دیکھا، اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کہ پاکیزہ بات اس پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ (زمین میں) مضبوط ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔ وہ (درخت) اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دے رہا ہے، اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔“

اللہ رب العزت نے ان آیات میں ایک پاکیزہ درخت کی مثال بیان کی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے کلمة طیبة پاکیزہ کلام کی مثال جس شجر مبارکہ سے دی ہے اس شجر کے لیے آقا علیہ السلام نے فرمایا:

أنا شجرة، و فاطمة حملها، و علی لقاحها، والحسن والحسین ثمرتها، والمُحِبُّونَ أهل البیت ورقها، من الجَنَّة حقاً حقاً۔ (دیلمی، الفردوس بماثور الخطاب، ۱: ۵۲، رقم: ۱۳۵)

(خطاب نمبر: Gb-30)، (مقام: ایوان اقبال لاہور)، (تاریخ: 17 اپریل 2016ء)

”میں درخت ہوں، فاطمہ اُس کی ٹہنی ہے، علی اُس کا شگوفہ ہیں (جس پر پھل لگتے ہیں) اور حسن و حسین اس کا پھل ہیں اور اہلِ بیت سے محبت کرنے والے اُس کے پتے ہیں، یہ سب جنت میں ہوں گے، یہ حق ہے، حق ہے۔“

اس حدیث مبارک میں آقا علیہ السلام نے اپنی ذات کو مثلِ درخت قرار دے کر اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کی تمام شخصیات اور ان سے محبت کرنے والوں کا تعلق اپنی ذات کے ساتھ جوڑا ہے۔ اس لیے کہ ٹہنی، شگوفہ، پھل اور پتے یہ تمام کے تمام اپنے درخت کی نسبت سے ہی نہ صرف قائم رہتے ہیں بلکہ ان کی پہچان بھی وہی درخت ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ جو ذائقہ، تاثیر، کیفیت اور حلاوت اس درخت کے اندر ہے، اس کی شاخوں میں بھی وہی منتقل ہوگا، اس کی ٹہنیوں میں بھی وہی رس شامل ہوگا، اس درخت کے شگوفوں پر لگنے والے پھولوں سے بھی وہی مہک آئے گی اور جو پھل لگے گا، اس میں بھی اسی درخت کی تاثیر اور حلاوت شامل ہوگی۔ پس اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کے مقدس نفوس اور ان سے محبت کرنے والوں کے اندر ان کی اصل یعنی ذاتِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رنگ، مہک، اوصاف کی جھلک اور سیرت کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔

آیئے! آقا علیہ السلام کی زبان مبارک سے اپنی ٹہنی، شگوفہ اور پھل کا ذکر سنتے ہیں:

سیدہ کائنات علیہا السلام؛ شجرِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ٹہنی ہیں

آقا علیہ السلام نے اپنی ذات کی شکل میں موجود شجر مبارک کی ٹہنی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

فاطمة شجنة منی یبسطنی ما بسطها ویقبضنی ما قبضها۔

(مسند احمد بن حنبل، فضائل الصحابہ، ۲۰: ۷۲۵، رقم: ۱۳۴۷)

”فاطمہ میری شاخ ثمر بار ہے، اس کی خوشی مجھے خوش کرتی ہے اور اُس کی پریشانی مجھے پریشان کر دیتی ہے۔“

☆ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ نَادَى مُنَادٍ مِنْ وَرَاءِ الْحِجَابِ: يَا أَهْلَ الْجَمْعِ، غُضُّوا أَبْصَارَكُمْ عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حَتَّى تَمُرَّ۔ (المستدرک علی الصحیحین: ۴۷۲۸)

”قیامت کے دن ایک منادی حجاب کے پیچھے سے ندا دے گا: اے اہل محشر! اپنی نگاہیں (ادب سے) جھکا لو یہاں تک کہ فاطمہ بنت محمد گزر جائیں۔“

سیدہ کائنات فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کی صورت میں موجود شجرِ مصطفی کی ٹہنی کی عصمت وطہارت، ادب اور حجاب وحیاء کا عالم یہ ہوگا کہ قیامت کے روز جو فرشتہ اس اعلان کرنے پر معمور ہوگا، وہ بھی سیدہ کائنات علیہا السلام کے ادب میں اُن کے سامنے ظاہر نہ ہوگا بلکہ پردے کے پیچھے سے اعلان کر رہا ہوگا۔ اس حدیث مبارک کے اندر ادبِ بارگاہِ اہلِ بیت اور بارگاہِ سیدہ کائنات کا ادب سکھایا جارہا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ ادب وحیا صرف یہاں نہیں بلکہ اہلِ محشر کو بھی اس ادب وتکریم کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

☆ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہے کہ قیامت کے دن سیدہ کائنات علیہا السلام کی آمد کے وقت اعلان ہوگا:

یا اهل الجمع نکسوا روسکم وغضوا ابصارکم حتی تمر فاطمة بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی الصراط، فتمر ومعها سبعون الف جارية من الحور العين كالبرق اللامع۔ (محب الطبری، ذخائر العقبیٰ فی مناقب ذوی القربیٰ، ص: ۹۶)

”اے اہلِ محشر! اپنے سروں کو جھکا لو، اپنی نگاہوں کو نیچا کرلو، سیدہ کائنات علیہا السلام گزر رہی ہیں۔ سیدہ کائنات علیہا السلام کے ساتھ ستر ہزار حورانِ جنت کا ایک قافلہ ہوگا اور آپ علیہا السلام براق پر سوار ہو کر جارہی ہوں گی۔“

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ؛ شگوفۂ شجرِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

شجرِ مصطفی کی ٹہنی یعنی سیدہ کائنات علیہا السلام کی عظمت کا عالم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سننے کے بعد اب آیئے اس درخت پر لگنے والے شگوفے یعنی سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مقام ومرتبہ کو بھی بزبانِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنتے ہیں کہ آقا علیہ السلام نے اپنی ذات کی صورت میں موجود درخت پر لگنے والے شگوفہ جس سے پھول نکلتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے کیا ارشاد فرمایا۔

☆ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: علی منی وانا من علی۔

(سنن ترمذی، کتاب المناقب، رقم الحدیث: ۳۷۱۹)

”علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں۔“

☆ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلنَّظْرُ اِلٰی وَجْهِ عَلِيٍّ عِبَادَةٌ (امام حاکم، مستدرک علی الصحیحین، ۳: ۱۵۲، رقم الحدیث: ۱۶۲)

”علی کے چہرے کو تکنا عبادت ہے۔“

☆ حضرت طلیق بن محمد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے

ہیں؟انہوں نے جواب دیا کہ میں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

اَلنَّظْرُ اِلٰی عَلِیٍّ عِبَادَۃٌ۔ (طبرانی، المعجم الکبیر، ۱۸: ۱۰۹، رقم الحدیث: ۱۶۴)

''علی کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔''

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

ذِکْرُ عَلِیٍّ عِبَادَۃٌ. (دیلمی، الفردوس بماثور الخطاب، ۲: ۲۴۴، رقم الحدیث: ۱۳۵۱)

''علی کا ذکر بھی عبادت ہے۔''

مذکورہ تین روایات میں آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرے کو دیکھنا، آپ کے جسمِ اقدس کو دیکھنا حتی کہ آپ رضی اللہ عنہ کے ذکر کرنے کو بھی عبادت قرار دیا ہے۔

یہ فرمان مصطفی ﷺ صرف ذاتِ علی رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی اور صحابی کے لیے آپ ﷺ نے ایسے کلمات ارشاد نہیں فرمائے۔ ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرے کو تکنا اور آپ رضی اللہ عنہ کے ذکر کو ہی عبادت کیوں قرار دیا؟

اس حوالے سے ذہن اس امر کی جانب جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں یہ تینوں کلمات واقعہ ردِ شمس کے بعد فرمائے ہوں۔ واقعہ ردِ شمس کچھ اس طرح ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ ایک غزوہ سے واپس آ رہے تھے کہ آپ ﷺ کو آرام کرنے کی طلب محسوس ہوئی تو آپ ﷺ نے تھوڑا آرام فرمانا چاہا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو آقا علیہ السلام نے کسی غرض سے کہیں بھیجا ہوا تھا اور ان کی عدم موجودگی میں عصر کی نماز بھی ادا فرمالی تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ تفویض کردہ کام کرنے کے بعد آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں سر رکھا اور آرام فرمانے لگے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ آپ ﷺ نے اتنی دیر آرام فرمایا کہ سورج بھی ڈھل گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایک نگاہ سے غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہے تھے اور دوسری نگاہ سے حضور نبی اکرم ﷺ کے چہرہ والضحیٰ کو دیکھ رہے تھے، نمازِ عصر کی قضاء کا غم ستانے لگتا تو فوراً اس کو جھٹک کر اپنے اس اعزاز پر فخر محسوس کرتے کہ سید العالم کا سر ان کی گود میں محوِ آرام ہے۔ یہ کوئی عام بات نہیں۔

نمازیں پھر ادا ہوں گر قضا ہوں
نگاہوں کی قضائیں کب ادا ہوں

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آج عقیدۂ علی کی آزمائش تھی، اللہ دیکھ رہا تھا کہ آج علی اپنی نمازِ عصر ادا کرنے کے لیے میرے محبوب ﷺ کو بیدار کرتا ہے اور میری نماز کی طرف

جاتا ہے یا نمازوں کی نماز کی طرف جاتا ہے۔۔۔آج علی شمس کو تکتا ہے یا شمس الضحیٰ کو تکتا ہے۔۔۔آج علی میرے سورج کو دیکھتا ہے یا اس سراج منیر ﷺ کو دیکھتا ہے۔

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ادبِ مصطفیٰ ﷺ کو ترجیح دی اور آپ ﷺ کے آرام کا خیال رکھا اور اپنی نمازِ عصر کا قضا ہونا تو قبول کر لیا مگر آپ ﷺ کے آرام میں خلل پیدا نہ کیا بلکہ اپنی گود میں موجود چہرہ مصطفیٰ ﷺ کو تکتے رہے۔جب سورج غروب ہو گیا اور عصر کا وقت گزر گیا تو آقا ﷺ کی آنکھ کھلی۔آپ ﷺ نے پوچھا: علی! نماز پڑھ لی۔سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔آقا علیہ السلام سمجھ گئے کہ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے میرے آرام کی خاطر اپنی نمازِ عصر قربان کر دی۔سیدۃ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ آقا علیہ السلام نے اپنے دست اقدس اٹھائے اور یوں دعا کرنے لگے:

اللھم إن عبدك علیا احتبس بنفسه علی نبیك فرد علیه شَرْقَهَا۔

”اے اللہ! تیرا بندہ علیؓ تیرے نبی کے لیے اپنے آپ کو روک کر بیٹھا رہا، پس اس کے لیے سورج کو واپس لوٹا دے۔“

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے یوں دعا فرمائی:

اللھم إن علیا کان فی طاعتك وطاعة رسولك فاردد علیه الشمس۔ (طبرانی، المعجم الکبیر، ج:۲۴، ص:۱۵۱، رقم:۳۹۰)

اے اللہ! علی تیری اور تیرے مصطفیٰ ﷺ کی اطاعت و پیروی میں مشغول و مصروف تھا۔پس اس پر سورج کو واپس پلٹا دے۔“

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

فطلعت الشمس حتی وقعت علی الجبال وعلی الأرض۔ ثم قام علی، فتوضأ وصلی العصر ثم غابت وذلك فی الصهباء۔ (الطحاوی، مشکل الآثار، ۲: ۹)

پھر سورج واپس طلوع ہوا، یہاں تک کہ وہ پہاڑوں اور زمین پر چمکنے لگا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، وضو کیا اور عصر کی نماز ادا کی، پھر سورج دوبارہ غروب ہو گیا۔یہ واقعہ صہباء کے مقام پر پیش آیا۔

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ جب سورج ڈوبتا ہے تو وہ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر شکر ادا کرتا ہے۔جب زبان مصطفیٰ ﷺ سے نکلا کہ اے اللہ! سورج کو واپس پلٹا دے تو اللہ نے اپنی بارگاہ میں سجدہ ریز سورج کو دعائے مصطفیٰ کے پیشِ نظر واپس پلٹ جانے کا حکم دیا۔

اب ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ جب آپ ﷺ کا سرِ مبارک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں تھا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس دورانیہ میں کیا کر رہے تھے؟ لازمی بات ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی گود میں جب چہرہ

مصطفیٰ ﷺ تھا تو اس وقت سیدنا علی ؓ چہرہ مصطفیٰ کو تکتے جا رہے تھے اور اس تکنے کے دوران اس خلوت میں آقا ﷺ کا تصرف بھی جاری تھا اور آپ ﷺ کا فیض بھی رواں دواں تھا۔ یہ وقت وہ تھا جب خلوت میں سیدنا علی ؓ کو حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنے تصرف سے اپنا سارا فیض عطا کر دیا۔ اپنی نگاہ اس لیے بند کی کہ علی ؓ عام معمول کے مطابق اپنی نظروں کو جھکائے نہیں بلکہ ٹکٹکی باندھ کر صرف میرے چہرہ اقدس کی طرف دیکھتا رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صفاتِ علی ؓ صفات نبی ﷺ میں گم ہو گئیں۔۔۔ نگاہِ علی ؓ نگاہِ مصطفیٰ ﷺ کھو گئی۔۔۔ تجلیات علی ؓ، تجلیاتِ مصطفیٰ ﷺ بن گئیں۔۔۔ حُسنِ علی، حُسنِ مصطفیٰ ﷺ میں ڈھل گیا۔۔۔ کرامتِ علی، کرامتِ مصطفیٰ ﷺ بن گئی۔۔۔ ذکرِ علی، ذکرِ مصطفیٰ ﷺ ہو گیا۔۔۔ اب علی نہیں بلکہ خود مصطفیٰ بولتے تھے۔۔۔ اب علی خود نہیں بلکہ مصطفیٰ نظر آتے تھے۔۔۔ اب فکر مرتضیٰ، فکر مصطفیٰ ہو گئی۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی ؓ اپنا سب کچھ آقا ﷺ پر فنا کر چکے تو آقا ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا: النظر علی وجه علی العبادة۔۔۔ النظر الی علی العبادة۔۔۔ الذکر علی العبادة۔ اب علی ؓ کو دیکھو تب بھی عبادت ہے، سنو تب بھی عبادت ہے اور علی ؓ کا ذکر کرو تب بھی عبادت ہے۔

یہ سب اسی فیض کا اثر تھا کہ حضرت علی ؓ نے برملا اعلان کیا:

سلونی، واللہ لا تسالونی عن شیء یکون الی یوم القیامة الا اخبرتکم، وسلونی عن کتاب اللہ، فواللہ ما من آیة الا و انا اعلم ابلیل نزلت ام بنهار فی سهل ام فی جبل. (محبّ طبری، الریاض النضرة، ۲: ۱۹۸)

مجھ سے جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، پوچھو میں تمھیں اس کا جواب کتاب اللہ سے دوں گا۔ اس قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں جس کی مجھے خبر نہ ہو کہ وہ دن میں نازل ہوئی یا رات میں، صحرا میں نازل ہوئی یا پہاڑی کی چوٹی پر۔

آپ ؓ قرآن کے ظاہری علوم اور باطنی علوم ہر دو کو جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا ابن عباس ؓ فرماتے ہیں:

علمِی وعلمُ أصحابِ محمّد ﷺ فی علمِ علیّ ؓ کقطرَةٍ فی سبعَةِ أبحرٍ۔ (ابن الأثیر، أسد الغابہ، ۴: ۳۹)

”میرا علم اور تمام صحابہ کرام کا علم علیؓ کے علم کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے سات سمندروں کے مقابل ایک قطرہ۔“

حسنین کریمین علیہما السلام ؛ شجرِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھول

شجرِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ٹہنی (سیدہ کائنات سلام اللہ علیہا) اور شگوفہ (سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) کے ذکر کے بعد اب شجرِ مصطفی کے پھولوں اور پھلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر سیدہ کائنات اور علی المرتضیٰ علیہما السلام کو اس قدر عظمتوں سے نوازا گیا ہے تو ان کی اولاد پاک حسنینِ کریمین علیہما السلام کو کیسے کیسے انعام واکرام اور مقام و مرتبہ سے نوازا گیا ہوگا۔

☆ آقا علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

ان الحسن والحسین ھما ریحانتای من الدنیا۔

(صحیح بخاری، کتاب فی بیان الاخلاق، باب الرحمۃ والشفقۃ علی الطفل وتقبیلہ ومعانقتہ، ۱۸، الرقم: ۵۹۹۴)

”حسن و حسین (علیہما السلام) یہ دونوں میری دنیا کے پھول ہیں۔“

☆ دوسری روایت میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ریحانتی من ھذہ الامۃ۔ (النسائی، سنن الکبری، ۵: ۴۹، ۱۵۰، الرقم: ۸۱۶۷، ۸۵۲۹)

”یہ دونوں ہی تو میری امت کے پھول ہیں۔“

مفسرین اور محدثین نے ”ریحانہ“ کے بارے میں فرمایا کہ اس سے مراد رحمت بھی ہے، رزق بھی ہے اور راحت و چین اور سکون بھی ہے۔

☆ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کل سبب ونسب منقطع یوم القیامۃ الا سببی ونسبی۔ (الطبرانی، معجم الکبیر، ۱۱: ۱۹۴، الرقم: ۱۱۶۲۱)

”میرے رشتے اور نسب کے سوا قیامت کے دن ہر رشتہ اور نسب منقطع ہو جائے گا۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

کل بنی أنثی فإن عصبتھم لأبیھم ما خلا ولد فاطمۃ، فإني أنا عصبتھم و أنا أبوھم۔

(احمد بن حنبل، فضائل الصحابہ، ۲: ۶۲۶، رقم: ۱۰۷۰)

”ہر عورت کی اولاد کا نسب اپنے باپ کی طرف سے ہوتا ہے سوائے اولاد فاطمہ کے، میں ہی اُن کا نسب ہوں اور میں ہی اُن کا باپ ہوں۔“

شجر نبوت پر لگنے والے پھل اور پھول حسنین کریمین ہیں۔ اس لیے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں بلاتے اور بلا کر انھیں سونگھتے تھے، ان کی مہک سے لطف اندوز ہوتے تھے اور پھر انہیں اپنے گلے سے لگا لیتے تھے۔ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں

حاضر ہوا تو (دیکھا کہ) حسن و حسین علیہما السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یا گود میں کھیل رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے محبت کرتے ہیں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وکیف لا أحبهما وهما ريحانتي من الدنيا أشمهما۔

(طبراني، المعجم الکبیر، ۴: ۱۵۵، رقم: ۳۹۹۰)

”میں ان سے محبت کیوں نہ کروں حالانکہ میرے گلشنِ دُنیا کے یہی تو دو پھول ہیں جن کی مہک کو سونگھتا رہتا ہوں (اُنہی پھولوں کی خوشبو سے کیف و سرور پاتا ہوں)۔“

☆ اگر ”ریحانہ“ کو رزق کے معنی میں لیا جائے تو ترجمہ یوں ہوگا کہ حسن اور حسین میرا رزق ہیں۔ اس لیے کہ اولاد رزق ہوتی ہے جس پر والدین فخر کرتے ہیں۔ آقا علیہ السلام ان دونوں پر فخر کا اظہار اکثر فرماتے۔ ایک موقع پر سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

ان ابني هذا سيد، ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين۔ (صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم للحسن بن علی رضی اللہ عنہما، رقم الحدیث: ۲۷۰۴)

”میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا۔“

یعنی حسن وہ ہیں جو صلح اور امن کے علم بردار ہوں گے اور امت محمدی کو امن و سکون کے فروغ کے ذریعے رزق عطا کریں گے۔

☆ امام حسین علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

حسين مني وأنا من الحسين۔

یعنی میرا حسین کلمہ حق کے ساتھ، انقلاب کے ساتھ، قوت و جرات کا شہکار اور علم بردار بن کر میری امت کو رزق عطا کرے گا۔

پس جب ہم حسنین کریمین علیہما السلام کی صورت میں شجرِ مصطفی کے پھولوں اور پھلوں کو دیکھتے ہیں تو ان میں ہمیں تاثیر اور ذائقہ شجرِ مصطفی ہی کا محسوس ہوتا اور دکھائی دیتا ہے۔ ان سے جو بھی انوار لیں گے، وہ دراصل اس شجرِ مصطفی ہی کے انوار و فیوضات ہیں۔

شہادت کی نعمت اور اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام

اللہ رب العزت نے چار چیزیں اہلِ بیت اطہار کے حصے میں رکھ دی ہیں:

۱۔ مودت ۲۔ ابتلاء و آزمائش ۳۔ صبر ۴۔ رضا

یہ چاروں امور جس طرح اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام کے حصے میں آئے، کسی کے حصے میں نہ آئے اور یہ اہلِ بیت کا خاصہ بن گئے۔ ہر اک چیز انہیں انتہا میں نصیب ہوئی۔ مودّت ملی تو سرورِ کائنات کی بے مثال ولازوال محبت و مودت نصیب ہوئی۔۔۔ ابتلاء وآزمائش ملی تو کوفہ اور کربِ وبلا میں اس کی بے نظیر مثالیں قائم کردیں۔۔۔ صبر ورضا نصیب ہوا تو سیدہ زینب وامام الساجدین امام زین العابدین علیہما السلام اور دیگر اسیر، صبر ورضا کا پیکر بن گئے۔

مودت بھی انہیں وہ ملی ہے جس جیسی مودت کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ ابتلاء اور آزمائش بھی انہیں وہ ملی ہے جس جیسی آزمائش کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ پھر صبر بھی انہیں وہ ملا ہے کہ اس جیسا صبر کسی اور کو نہیں ملا اور پھر مقام رضا بھی اہلِ بیت اطہار کو وہ ملا ہے کہ اس جیسا مقام کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے لے کر امام حسن عسکری رضی اللہ عنہم تک سبھی ائمہ کرام کو شہید کیا گیا۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو خارجی ابن ملجم نے شہید کیا۔۔۔ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو جعدۃ بنت الاشعث نے زہر دے کر شہید کیا۔۔۔ سیدنا امام حسین علیہ السلام کو کربلا میں بہتر ساتھیوں سمیت شہید کیا گیا۔۔۔ سیدنا امام زین العابدین علیہ السلام کو اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک نے زہر دے کر شہید کیا۔۔۔ امام محمد باقر کو اموی حکمران ہشام بن عبد الملک نے زہر دلوا کر شہید کیا۔۔۔ امام جعفر الصادق علیہ السلام کو عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور نے زہر دلوا کر شہید کیا۔۔۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو عباسی حاکم ہارون الرشید نے زہر دلوا کر شہید کروایا۔۔۔ امام علی الرضا علیہ السلام کو خلیفہ مامون الرشید نے انگور میں زہر ملا کر شہید کروایا۔۔۔ امام محمد جواد تقی علیہ السلام کو خلیفہ معتصم باللہ نے زہر دلا کر شہید کیا۔۔۔ امام علی نقی علیہ السلام کو خلیفہ معتز باللہ نے زہر دلا کر شہید کروایا۔۔۔ امام حسن العسکری علیہ السلام کو معتمد باللہ نے زہر دلا کر شہید کرایا۔ یعنی سبھی ائمہ اہل بیت کو ایک ایک کر کے شہید کیا گیا۔

اہلِ بیتِ اطہار کی ان مقدس ہستیوں کی شہادت سے یہ واضح پیغام ملتا ہے کہ اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہادت اس قدر عزیز نہ ہوتی تو پھر اہل بیت اطہار ایک ایک کر کے شہید نہ ہوتے۔ میدانِ کربلا میں امام حسین علیہ السلام اور خانوادہ رسول، پیکرِ صبر بنے شہید ہو رہے تھے، لہو بہا رہے تھے، گردن کٹا رہے تھے مگر اپنے نانا کے دین کو جھکنے نہیں دے رہے تھے۔ اپنے لہو کے خراج کے ذریعے دین کو سربلند کر رہے تھے۔ شہادت ان کی گھٹی میں دی گئی تھی اور ان کا مقدر بنا دی گئی تھی۔

جب سیدنا امام حسین علیہ السلام کربلا کی طرف جا رہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو علم تھا کہ حسین علیہ السلام اپنی اس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کے بارے میں آقا علیہ السلام نے ان کے بچپن میں ہی آگاہ فرما دیا تھا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سیدنا امام حسین علیہ السلام کو علم نہ ہو کہ میری منزل وادی کرب وبلا ہے۔ جب صحابہ

کرام ﷺ کو معلوم ہے تو کیا آپ علیہ السلام کو معلوم نہ ہوا ہو گا کہ میں اپنے مقتل کی جانب جا رہا ہوں۔ سیدنا امام حسین علیہ السلام کو سب معلوم تھا اور وہ جانتے تھے لیکن پھر بھی سفر جاری رکھتے ہیں، ٹھہرتے نہیں، رکتے نہیں۔ نہ خود جھکتے ہیں اور نہ کسی اور کو جھکنے دیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ میری شہادت اصل میں دینِ مصطفی کی عظمت کا نام ہے۔

واقعہ کربلا نے یزیدیت اور حسینیت کا فرق بتا دیا کہ یزید تاریکی کا نام ہے جبکہ حسین علیہ السلام روشنی کا نام ہے۔۔۔ یزید بربریت کا نام ہے جبکہ حسین علیہ السلام انسانیت کا نام ہے۔۔۔ یزید ظلم کا نام ہے جبکہ حسین علیہ السلام عدل کا نام ہے۔۔۔ یزید دہشت گردی کا نام ہے جبکہ حسین علیہ السلام امن کا نام ہے۔۔۔ یزید جہالت کا نام ہے جبکہ حسین علیہ السلام علم اور شعور کا نام ہے۔۔۔ یزید کرپشن کا نام ہے جبکہ حسین علیہ السلام رفعت و بلندی کا نام ہے۔۔۔ حسینیت نام ہے کردار کا اور حسین علیہ السلام نام ہے صبر و رضا کا۔ کربلا میں امام حسین علیہ السلام نے اس محبت کا قرض اتار دیا جو حضور علیہ السلام نے انھیں عطا کی تھی۔

شہادت امام حسین علیہ السلام سے درحقیقت یزید ختم ہو گیا اور حسین علیہ السلام کے نانا کا دین زندہ ہو گیا۔ اگر حسین علیہ السلام نہ ہوتے تو قیامت تک راہِ خدا میں جانیں لٹانے والا کوئی نہ ہوتا۔ آج اگر ہمیں عالمِ کفر کے مقابلے میں شہادتیں دینے والے آتے ہیں تو یہ شہادتیں اس لیے دی جا رہی ہوتی ہیں کہ حسین علیہ السلام کا کردار ان کے سامنے ہوتا ہے۔ ہر دور کے یزید بھی ہیں اور ہر دور کے غلامانِ حسین بھی ہیں۔ وقت کا یزید ظلم کرتا ہے تو غلامانِ حسین صبر کرتے ہیں۔۔۔ وقت کا یزید استحصال کا نام ہے جبکہ غلامانِ حسین صبر و تحمل اور حکمت و دانش کا نام ہیں۔

آج کے اس معاشرہ میں اپنے اخلاق و کردار اور اپنے ایمان و حمیت کو بچانا اور وقت کے فرعونوں، نمرودوں اور یزیدوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جانا کربلا کا سبق ہے۔ اللہ رب العزت بحرِ عصمت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام اور بحرِ شجاعت و ولایتِ علی مرتضی کرم اللہ وجہہ اور ان کی ذیلی ابحار سیدنا حسنین کریمین علیہما السلام کے فیوضات و عنایات، لطف و کرم اور ان کی بارگاہ کی عطا و خیرات سے ہمیں ہمیشہ مستفیض و سیراب فرمائے۔ مصطفی ﷺ کے پھولوں، ٹہنیوں، شگوفوں، پھولوں کی مہک کی صورت میں موجود رزق امت کو ہمیشہ منتقل ہوتا رہے۔ اس چمنستانِ مصطفوی کی مہک سے اس ملک و قوم اور اس امت سے منافرت، انتشار اور فساد کی ہوا ختم ہوتی چلی جائے اور عشق و محبتِ اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کی فضا جنم لیتی رہے۔ آج امت کو اس کی ضرورت بھی ہے اور یہ وقت کا تقاضا بھی ہے۔

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؓ

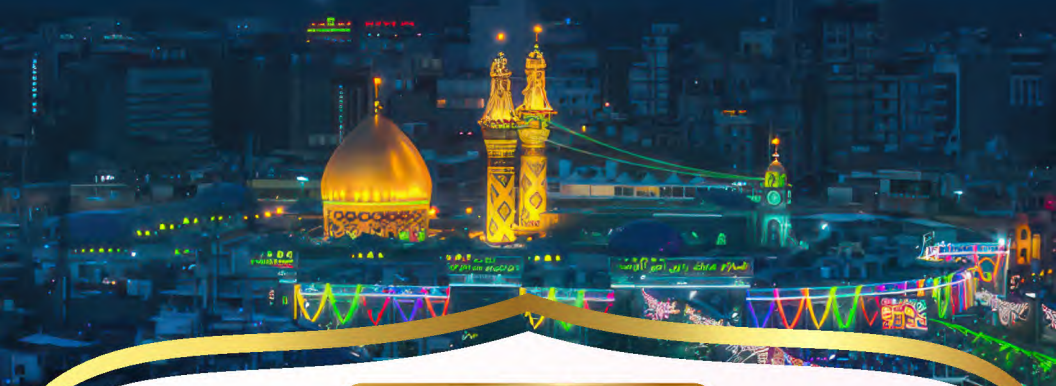

ڈاکٹر نعیم انور نعمانی

راہِ حق میں اللہ اور اس کے رسول کی خاطر جان دینے والے تمام شہدائے اسلام بالخصوص شہدائے کربلا نے اپنی زندگیوں کے چراغ بجھا کر اسلام کے چراغ کو روشن کیا ہے۔ اپنی جان اسلام کی خاطر دے کر قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو جینے کا سلیقہ سکھا دیا ہے۔ عام قتل انسان کو موت دیتا ہے مگر شہید کا قتل اس کو حیاتِ ابدی دیتا ہے۔ قرآن حکیم شہادت کو موت کہنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ (البقرہ، ۲: ۱۵۴)

”اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مت کہا کرو کہ یہ مُردہ ہیں، (وہ مُردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں۔“

گویا شہادت ایسی حیات ہے جو ہمارے احاطہ ادراک میں نہیں آسکتی اور اگر ہم اسے عقل کے پیمانے سے سمجھنا بھی چاہیں تو ہرگز سمجھ نہیں سکتے۔ شہدائے اسلام اور شہدائے کربلا نے اپنے وجودوں سے ہزاروں وجودوں کو روشن کیا ہے۔ ہزاروں بجھے ہوئے چراغوں کو منور و تاباں کیا ہے۔ انھوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کیا ہے اور اسلام کو قوتِ دائمی دے کر اس کے چراغ کو ہمیشہ کے لیے روشن کر دیا ہے۔ شہید چونکہ امت و قوم کے لیے حیاتِ نو بنتا ہے، اس وجہ سے جونہی اس کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرتا ہے تو:

یغفر له فی اول دفعة من دمة۔

پہلے قطرہ خون کے گرنے کے ساتھ ہی اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔(سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، باب فی الفضل الشہادۃ فی سبیل اللہ، الرقم الحدیث: ۲۷۹۹)

اوائل اسلام سے لے کر آج تک اسلام میں بڑی بڑی شہادتیں ہوئی ہیں مگر ہر دور اور ہر زمانے میں جو مقام، مرتبہ اور جو قبولیت و مقبولیت عند اللہ اور عند الناس شہادتِ امام عالی مقام امام حسین علیہ السلام اور شہدائے کربلا کو حاصل ہے، اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ یہ اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام کے مقدس نفوس کی شہادت تھی۔

قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ نے یہ حکم دیا کہ اپنی امت کو اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام سے محبت و مودّت کرنے کی تلقین فرمائیں۔ ارشاد فرمایا:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی۔

”فرما دیجیے: میں اِس (تبلیغِ رسالت) پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا مگر (میری) قرابت (اور اللہ کی قربت) سے محبت (چاہتا ہوں)۔“ (الشوریٰ، ۴۲: ۲۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت سے ابلاغِ دین، تعلیماتِ اسلام اور عرفانِ توحید دینے کے عوض میں صرف اور صرف اپنی قرابت اور اپنی ذریت کی محبت کا تقاضا کیا ہے کہ میری قرابت اور میری ذریت کے حقوق کی پاسداری کرنا، ان کی عزت و تکریم کا خاص خیال کرنا، ان سے محبت و چاہت اور انس و مودّت کا تعلق قائم کرنا۔ اس لیے کہ ان سے محبت مجھ سے محبت ہے اور ان سے بغض مجھ سے بغض ہے۔

شانِ اہلِ بیت اطہار: احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بیت علیہم السلام کی بابت اپنی امت کو یاد دہانی کرائی ہے کہ ان کے حقوق کا خیال و پاس رکھنا اور ان کے حقوق کو ادا کرنے کے حوالے سے اللہ سے ڈرتے رہنا۔ ارشاد فرمایا:

اذکرکم اللہ فی اھل بیتی، اذکرکم اللہ فی اھل بیتی، اذکرکم اللہ فی اھل بیتی۔ (مسلم، الصحیح، کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل علی بن ابی طالب، ۳: ۱۸۷۳، رقم: ۲۴۰۸)

میں تمھیں اپنی اہلِ بیت کے حوالے سے اللہ یاد دلاتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی قرابت اور اپنے اہل بیت سے محبت کا اندازہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی احادیث اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسنین کریمین علیہما السلام سے نہ صرف اپنی محبت کا اظہار کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی درخواست کی کہ تو بھی ان سے محبت کر۔ اللہ

رب العزت کی بارگاہ میں آپ ﷺ کی یہ دعا ہمیں محبتِ اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کی محبت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

☆ آپ ﷺ نے فرمایا:

اللھم انی احبھما فاحبھما واحب من یحبھما۔

(ترمذی، جامع الصحیح، ۵: ۶۵۶، ابواب المناقب، رقم: ۳۷۶۹)

اے اللہ میں ان دونوں (حسن و حسین) سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر اور ان سے محبت کرنے والوں سے بھی محبت کر۔

☆ پھر فرمایا:

من ابغضھما او بغی علیھما ابغضتہ، ومن ابغضتہ، ابغضہ اللہ۔ (طبرانی، المعجم الکبیر، ۳: ۵۰، رقم: ۲۶۵۵)

جس نے ان سے بغض رکھا یا ان سے بغاوت کی وہ میرے ہاں مبغوض ہوا اور جو میرے ہاں مبغوض ہوا وہ اللہ کے غضب کا شکار ہو گیا۔

☆ ایک اور مقام پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من احب الحسن والحسین فقد احبنی ومن ابغضھما فقد ابغضنی۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب فی فضائل اصحاب رسول اللہ ﷺ، باب فضل الحسن والحسین، رقم الحدیث: ۱۴۳)

جس نے حسن اور حسین سے محبت کی اس نے درحقیقت مجھ سے ہی محبت کی اور جس نے حسن و حسین سے بغض رکھا اس نے مجھ سے ہی بغض رکھا۔

☆ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل بیت سے بار بار حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا کہ میں اپنے بعد تمھارے اندر دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ان کے حقوق کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا اور ان سے ہر حال میں حسنِ سلوک اختیار کرتے رہنا۔ زید بن ارقم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إني تارك فيكم الثقلين: اولھما کتاب اللہ فیہ الھدی والنور، فتمسکوا بکتاب اللہ، وخذوا بہ فحث علیہ ورغب فیہ، ثم قال: واھل بیتی، اذکرکم اللہ فی اھل بیتی، ثلاث مرات. (سنن دارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فَضْلِ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ، رقم الحدیث: ۳۳۴۸)

میں تمہارے پاس دو بڑی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، پہلی تو اللہ کی کتاب، اس میں ہدایت ہے اور نور ہے، پس تم اللہ کی کتاب کو تھامے رہو اور اسے مضبوطی سے پکڑے رہو،'' غرض آپ ﷺ نے

کتاب اللہ کی طرف ابھارا اور رغبت دلائی پھر فرمایا: ''اور میرے اہل بیت، میں تم کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں''، آپ ﷺ نے تین بار یہ فرمایا۔

☆ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

إني تارك فيكم ما إن تمسكتم به لن تضلوا بعدي، احدهما اعظم من الآخر، كتاب الله حبل ممدود من السماء إلى الارض، وعترتي اهل بيتي ، ولن يتفرقا حتى يردا علي الحوض، فانظروا كيف تخلفوني فيهما۔ (سنن ترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله ﷺ، باب مَنَاقِبِ أَهْلِ بَيْتِ النَّبِيِّ ﷺ، رقم الحديث: ۳۷۸۸)

میں تم میں ایسی چیز چھوڑنے والا ہوں کہ اگر تم اسے پکڑے رہو گے تو ہر گز گمراہ نہ ہو گے: ان میں سے ایک دوسرے سے بڑی ہے، اللہ کی کتاب گویا وہ ایک رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے، اور دوسری میری ''عترت'' یعنی میرے اہل بیت ہیں۔ یہ دونوں ہر گز جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ یہ دونوں حوض کوثر پر میرے پاس آئیں گے، تو تم دیکھ لو کہ ان دونوں کے سلسلہ میں تم میری کیسی جانشینی کر رہے ہو۔''

اس حدیث مبارک میں فانظروا كيف تخلفوني فيهما (سو تم دیکھو میرے بعد ان سے کیا سلوک کرتے ہو) کے کلمات امت کے لیے انتہائی قابلِ توجہ ہیں۔ پس اس فرمانِ رسول ﷺ کے تناظر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارا تعلق اہلِ بیت اطہار علیہم السلام سے الا المودۃ فی القربیٰ کے میزان پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔۔۔؟ کیا ہم اہل بیت سے محبت و مودت کا تعلق رکھنے والے ہیں یا بغض و عناد کا تعلق رکھنے والے ہیں۔۔۔؟

یزیدی دورِ حکومت

حضرت امام حسین علیہ السلام اور کربلا میں خانوادہ نبوت کے ساتھ کربناک سلوک براہ راست رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے کی سزا قرآن مجید نے دنیا و آخرت کی لعنت اور عذاب مھین بیان کی ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ (الاحزاب، ۳۳: ۵۷)

''بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کو اذیت دیتے ہیں اللہ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت بھیجتا ہے اور اُس نے ان کے لیے ذِلّت انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

جس طرح رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اس طرح ہر وہ عمل جو رسول اللہ ﷺ کے لیے اذیت کا باعث ہے، وہ اللہ رب العزت کو اذیت دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اہلِ بیت کو اذیت دینا، آپ ﷺ کی ذات کو اذیت دینا ہے۔

واقعہ کربلا یزیدی لشکر کی طرف سے بغضِ اہلِ بیت اور عداوتِ اہلِ بیت کی صریح عملی مثال ہے جو ارض کربلا پر ثبت ہو چکی ہے۔ یزید ۶۰ ہجری میں تخت نشین ہوا۔ اس کے دورِ حکومت میں دین میں فساد آیا، احوالِ امت میں بگاڑ آیا اور حقوق اللہ اور حقوق العباد ضائع کیے گئے اور ہر طرف شر و فساد بپا ہو گیا۔ اوباش اور عیاش لونڈے جو حکمت و دانش اور فکر و تدبر سے محروم تھے، وہ معاملاتِ سلطنت کو سنبھالے ہوئے تھے۔ تمام تجربہ کار اور پختہ عمر کے افراد کو عہدوں سے معزول کر دیا گیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اپنی حکومت و سلطنت کو مضبوط کرنے کے لیے یزید نے تمام اکابر و اصاغر کو اپنی بیعت پر مجبور کیا۔ اس کی چار سالہ حکومت ظلم و فساد کا آئینہ دار تھی۔

معروف تابعی حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یزید بن معاویہ کی حکومت امت پر نحوست تھی۔ پہلے سال اس نے حضرت امام حسین اور رسول اللہ ﷺ کے خانوادے کو شہید کیا۔ دوسرے سال رسول اللہ ﷺ کے حرم پاک کو مباح کیا اور مدینہ منورہ کی سخت بے حرمتی کی اور تیسرے سال بیت اللہ کی بے حرمتی کی اور وہاں خون بہایا اور کعبۃ اللہ کو جلایا۔ (ابن کثیر، البدایہ والنھایۃ، ۸: ۲۲۱)

مقام و کردارِ حسین علیہ السلام

دس محرم الحرام کا دن اہلِ ایمان کے سامنے دو کردار رکھتا ہے: ایک کردار اسلام کی تعلیمات پر مبنی حق پرستانہ ہے جبکہ دوسرا کردار اسلام کی تعلیمات کے نام پر منافقانہ، فاسقانہ اور ظالمانہ ہے۔ تاریخ نے ایک کردار کو حسینی کردار کا نام دیا ہے اور دوسرے کردار کو یزیدی کردار کا نام دیا ہے۔ ان دونوں کرداروں کا ماضی تاریخ اسلام ہمارے سامنے یوں رکھتی ہے:

☆ حسین علیہ السلام وہ ہیں جو: فجعل یتوثب علی ظھر النبی۔
(ابن حبان، الصحیح، ۱۵: ۱۴۲، رقم: ۶۷۴۲)
رسول اللہ ﷺ کی پشت مبارک پر سوار ہو کر کھیلتے ہیں۔

☆ حسین علیہ السلام وہ ہیں جو: وجعل النبی ﷺ یتلثمه ویقبله۔
(ابن حبان، الصحیح، ۱۵: ۱۴۲، رقم: ۶۷۴۲)

جن کے چہرے اور ہونٹوں پر لب رسول مس ہوتے تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کو چومتے تھے۔

★ وہ حسین علیہ السلام جن کی شہادت کی خبر فرشتوں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے بچپن میں دے دی تھی:

لقد أتاني جبرائيل يخبرني أن ابني حسين يقتل۔

(سُنن الترمذی، باب فی مناقب الحسین، حدیث نمبر ۳۷۷۳)

”جبرائیل نے آکر مجھے بتایا کہ میرا بیٹا حسین قتل کیا جائے گا۔“

وہ حسین علیہ السلام جن کو باری تعالیٰ نے فضیلت و شرف کی نشانی بنایا تھا۔۔۔ جو یزیدی تیروں، نیزوں اور تلواروں کے سامنے اپنا سینہ تان کر کھڑے رہے۔۔۔ جنھوں نے دشتِ کربلا میں اپنے بیٹوں، بھتیجوں، بھانجوں اور اپنے سارے خانوادہ نبوت کی قربانی دی۔۔۔ جنھوں نے دینِ اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی تربیت کا حق کربلا میں ادا کر دیا۔۔۔ جنھوں نے مدینہ منورہ کی حرمت کی خاطر شہر نبی کو حزین اور غمگیں دل کے ساتھ چھوڑا تو اپنے نانا کی بارگاہ میں الوداعی سلام کرتے ہوئے زبانِ حال سے یوں عرض کیا:

تیرے قدموں سے دنیا اب مجھے دور کرتی ہے
کسی فاسق کی بیعت پر مجھے مجبور کرتی ہے

وہ حسین علیہ السلام جنھوں نے کربلا میں سارے خاندان کی جانثاری کے بعد وقتِ شہادت ایسا سجدہ کیا جس پر ساری خلق کو رشک ہے۔۔۔ وہ حسین جو راکب دوشِ مصطفی ہے۔۔۔ جو پروردہ آغوشِ بتول ہے۔۔۔ جو نقطہ و مرکز محبتِ علی شیر خدا ہے۔۔۔ جو کربلا کے ریگستان میں اتمامِ حجت کے لیے کھڑا رہا کہ تم نے اسلام کی خاطر بلایا تھا، اس لیے میں آیا ہوں اور جس نے ان کو زبانِ حال سے للکار کر کہا اگر تم اپنے وعدے سے پھر گئے ہو تو کیا ہوا:

تمھاری تیغ سے ڈر کر عظمتِ قرآن نہیں دوں گا
میں اپنی جان دے دوں گا مگر ایمان نہیں دوں گا

وہ حسین علیہ السلام جن کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حسین منی، حسین مجھ سے ہے۔۔۔ جن کے لیے آپ ﷺ نے انا من حسین اس لیے کہا کہ واقعہ کربلا کے بعد قیامت تک رسول اللہ ﷺ کے کردار اور اسوہ کی پہچان حسین علیہ السلام سے ہے۔

یزید لعین کا کردار

دوسری طرف امام عالی مقام امام حسین علیہ السلام کے مقابل یزید ہے۔ وہ یزید جو حسین علیہ السلام کے مقابل

وصفِ صحابیت، نسبتِ نبوت، تربیتِ رسول اور آغوشِ رسالت نہیں رکھتا۔ وہ پیغمبرِ اسلام اور تعلیماتِ اسلام کو حسین علیہ السلام کے مقابل کیا جان سکتا ہے۔۔۔؟ اس لیے کہ یزید فساد فی الدین اور احوال امت کو بدلنے کا نام تھا۔

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کے مطابق یزید وہ تھا:

اول من یبدل سنتی من بنی امیۃ رجل یقال لہ یزید۔ (العسقلانی، فتح الباری، ۱: ۲۱۶، رقم: ۱۲۰)

سب سے پہلا شخص جو میری سنت کو تبدیل کرے گا وہ بنوامیہ کا ایک شخص ہو گا جس کا نام یزید ہو گا۔

☆ یزید وہ تھا کہ جس کی امارت و حکومت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پناہ مانگتے تھے:

اعوذ باللہ من راس الستین و امارۃ الصبیان۔ (عسقلانی، فتح الباری، ۱۳: ۱۰)

☆ یزید وہ تھا جو اپنی حکومت کی خواہش اور طلب میں اپنے مخالفین کو قتل کرتا تھا: انہم یھلکون الناس بسبب طلبھم التملک۔

(بخاری، الصحیح، کتاب المناقب، ۳: ۱۳۱۹، رقم: ۳۴۱۰)

☆ یزید وہ تھا کہ جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشین گوئی کر دی تھی: ھلکۃ امتی علی یدی غلمۃ من قریش۔

میری امت کی بربادی قریش کے چند نو عمر اوباش لڑکوں کے ہاتھوں پر ہو گی۔ (صحیح بخاری، کتاب الفتن، رقم: ۷۰۵۸)

☆ یزید وہ تھا جس نے اپنی امارت اور حکومت کی مضبوطی کے لیے اسلام کے نام پر جبری بیعت کا سب سے پہلے آغاز کیا تھا اور بیعت بالجبر کا حکم دیتے ہوئے کہا تھا:

فخذ حسینا و عبداللہ بن عمرو عبداللہ بن الزبیر بالبیعۃ اخذا شدیدا، لیست فیہ رخصۃ حتی یبایعوا۔

(ابن حجر الہیتمی، الصواعق المحرقہ، ۲: ۶۴۱)

امام حسین، حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو کڑی حراست میں لے لو اور حکم کی تعمیل میں کسی قسم کی نرمی نہ برتو، یہاں تک کہ وہ میری بیعت کر لیں۔

☆ یزید وہ تھا کہ جس نے عترتِ رسول اور خانوادۂ نبوت کو قتل کیا اور گلشنِ نبوت کو مسمار کیا۔

☆ یزید وہ تھا کہ جس کے بارے میں دنیا یہ کہتی تھی کہ

کان فظاً غلیظاً، کان جلفاً و ظالماً، کان یتناول المسکر، کان یفعل المنکر۔ (ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۵: ۸۳)

جو انتہائی ترش رو اور بد اخلاق تھا۔ بہت بڑا ظالم تھا۔ شراب پیتا تھا اور ہر طرح کے برے اعمال سرانجام دیتا تھا۔

☆ یزید وہ تھا کہ جس کی حکومت کا آغاز قتلِ حسین سے ہوا تھا اور جس نے حرمین پاک کے تقدس کو بری طرح پامال کیا۔ جس کی حکومت کا اختتام واقعہ حرہ یعنی مدینۃ النبی کی بے حرمتی و پامالی اور بیت اللہ پر منجنیق کے ذریعے حملوں سے ہوا۔

☆ یزید وہ تھا جو سرعام شراب پیتا تھا اور محرمات کے ساتھ نکاح کرتا تھا اور اعلانیہ نماز کا تارک تھا۔

ویشرب الخمر، ینکح الامھات والبنات والاخوات ویدع الصلاۃ .(یعقوبی، التاریخ، ۲: ۲۵۳)

☆ یزید تاریخ اسلام میں وہ پہلا حکمران و بادشاہ تھا جو رعایا کو اپنا غلام سمجھتا تھا۔ واقعہ حرہ میں اس نے اہل مدینہ سے اپنا غلام بننے پر بیعت لی تھی:

یبایعوہ لیزید علی انکم عبید لہ ان شاء باعکم وان شاء اعتقکم۔ (ابن الجوزی، تذکرۃ الخواص، ص ۲۵۹)

یزید کی اس طرح بیعت کرو کہ تم اس کے غلام ہو، وہ چاہے تو تمھیں بیچ دے اور چاہے تو تمھیں آزاد کر دے اور جو اس کی بیعت کا انکار کرتا اس کا سر تن سے جدا کر دیا جاتا۔

☆ یزید وہ تھا کہ یعلقب بالطنابیر والکلاب والقرود۔

(ابن الجوزی، تذکرہ الخواص، ص ۲۵۹)

جو عیش و عشرت کی محفلیں سجاتا تھا، کتوں اور بندروں سے کھیلتا تھا۔

☆ یزید وہ تھا جو اولاد انبیاء کو قتل کرنے والا تھا:

ویقتل اولاد النبیین۔ (المسعودی، مروج الذھب، ۳: ۶۳)

یزید کربلا میں اہلِ بیتِ اطہار کا خون بہانے والا تھا۔۔۔ اسی کے حکم سے خانوادہ نبوت کے سر بریدہ وجودوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچلا گیا۔۔۔ یہی اہل بیت اطہار علیہم السلام کے مقدس مردوں کو نیزوں پر چڑھانے والا تھا۔۔۔ یہی امام حسین علیہ السلام کے کٹے ہوئے سر اور آپ علیہ السلام کے لبوں پر گستاخانہ انداز میں چھڑی مارنے والا تھا۔۔۔ یہی اہل بیت اطہار علیہم السلام کی عفیف و طاہر شہزادیوں کو قیدی بنانے والا تھا۔۔۔ یہی ان کو کوفہ اور دمشق اور شام کے بازاروں میں گھمانے والا تھا۔۔۔ یہی امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے لاغر جسم کو رسیوں اور بیڑیوں کے ذریعے جکڑنے والا تھا۔۔۔ یہی امام حسین علیہ السلام کو سر بریدہ دیکھ کر اظہار فرحت و مسرت کرنے والا اور رجزیہ اشعار پڑھ کر غزوہ بدر کا بدلہ لینے کا اظہار کرنے والا تھا۔ یزید اسلام کی مقدس پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔۔۔ یہ دین کی پاک و صاف چادر پر ایک دھبہ

ہے۔۔۔اس نے شریعت مصطفی ﷺ اور دینِ اسلام کی حدود کو توڑا ہے۔۔۔اس نے ہر طرف فسق و فجور کو فروغ دیا ہے اور ظلم و ستم کو عام کیا ہے۔

خلاصۂ کلام

یزید دنیا کا بدمست ترین انسان تھا جبکہ حسین علیہ السلام دین کے لیے سرمست ہیں۔۔۔یزید مجسمہ کفر و طغیان تھا جبکہ حسین علیہ السلام پیکرِ دین و ایمان ہیں۔۔۔یزید فسق و فجور کا نمائندہ تھا جبکہ حسین علیہ السلام سراپا تسلیم و رضا ہیں۔۔۔یزید ظلم و ستم کی جیتی جاگتی تصویر تھا جبکہ حسین علیہ السلام اخلاق محمدی کی زندہ تفسیر ہیں۔۔۔یزید اسلام میں ایک نفسِ شریر تھا جبکہ حسین علیہ السلام اسلام کی چادر تطہیر کے وارث ہیں۔

10 محرم الحرام 61 ہجری کے بعد اسلام نے ہر دور میں دو کردار دیے ہیں: ایک حسینی کردار ہے اور دوسرا یزیدی کردار ہے۔ حسینی کردار عدل و انصاف کا علمبردار ہے جبکہ یزیدی کردار ظلم و ستم کی علامت ہے۔۔۔ حسینی کردار محبت و شفقت سے معمور ہے جبکہ یزیدی کردار نفرت و عداوت سے بھرپور ہے۔۔۔ حسینی کردار ایثار و قربانی کا نام ہے جبکہ یزیدی کردار ہوا و ہوس کا نام ہے۔۔۔ حسینی کردار رحم و ترحم کی نشانی ہے جبکہ یزیدی کردار تحکم اور تظلم کا عنوان ہے۔

آج امت مسلمہ کو 10 محرم الحرام کو شہدائے کربلا کی یاد مناتے ہوئے اپنے کردار کو اسوۂ محمدی اور اسوۂ شبیری سے مزین کرنا ہوگا۔ جس کی طرف اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے:

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

خاکِ کربلا سے اپنی زندگی کو باکمال بنانے کے لیے اور زندہ ضمیر انسانوں کی طرح ہمیں آج یہ عہد کرنا ہوگا:

کرتی رہے گی پیش شہادت حسین کی
آزادئ حیات کا یہ سرمدی اصول
چڑھ جائے کٹ کے سر تیرا نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول

معاشرتی عدم برداشت: اسباب، اثرات اور تدارک

ڈاکٹر محمد تاج الدین کالامی

افرادِ معاشرہ کے باہمی احترام، رواداری اور تحمل مزاجی کسی بھی مہذب معاشرے کی پہچان ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے آج ہمارا معاشرہ ''عدم برداشت'' جیسی مہلک سماجی بیماری کا شکار ہے۔ یہ ایک ایسی ذہنی و اخلاقی کیفیت ہے جس میں انسان دوسروں کی رائے، نظریات، عقائد یا طرزِ زندگی کو برداشت کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اصطلاحاً برداشت کا مفہوم کسی منفی یا تکلیف دہ صورتحال میں اپنے غصے اور سخت ردعمل کو قابو میں رکھنا ہے۔ یہ صفت انسان کو طاقت دیتی ہے کہ وہ جوش، اشتعال یا انتقام کے جذبات کے باوجود عفو و درگزر کا مظاہرہ کرے۔

اسلام نے برداشت اور رواداری کو نہ صرف ایک فرد کی اخلاقی بلندی کا پیمانہ قرار دیا بلکہ اسے اجتماعی امن، بھائی چارہ اور خوشحالی کی بنیاد قرار دیا۔ قرآن مجید نے برداشت کرنے والوں کی تعریف واضح طور پر کی ہے:

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ (آل عمران، ۳: ۱۳۴)

''اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔''

حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”طاقتور وہ نہیں جو کُشتی میں دوسروں کو پچھاڑ دے، بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصے کو قابو رکھے۔“
(صحیح بخاری، کتاب الأدب، بَابُ الحَذَرِ مِنَ الغَضَبِ: ۶۱۱۴)

قرونِ اولیٰ کے اسلامی معاشرے میں اختلاف رائے کو باعث رحمت گردانا جاتا تھا۔ آج کا معاشرہ اس روایت کو بھلا بیٹھا ہے، اور اختلاف کو دشمنی بنالی ہے۔

عدم برداشت کے اسباب

معاشرتی عدمِ برداشت کے کئی اسباب ہیں جن کی وجہ سے معاشرہ فتنہ و فساد اور بے چینی و بے قراری کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ ذیل میں چند اسباب درج کیے جاتے ہیں:

(۱) علمی اور فکری ناپختگی اور تربیت کا فقدان

معاشرتی عدم برداشت کی ایک بڑی وجہ تعلیمی پسماندگی اور علمی اور فکری ناپختگی ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام مکالمہ، تحقیق اور تنقیدی شعور کے بجائے رٹے اور ایک جیسی سوچ پیدا کرنے کا حامل ہے۔ تعلیم کا مقصد صرف ڈگری حاصل کرنا نہیں بلکہ شعور پیدا کرنا ہونا چاہیے۔ بلاشبہ علم بہت بڑی نعمت اور انبیاء کرام علیہم السلام کی میراث ہے لیکن جب اس کے تقاضے پورے نہ کیے تو یہ علم انسان کو اللہ عزوجل کا قرب بخشنے کے بجائے بارگاہ خداوندی سے دور بھی کر سکتا ہے۔

تعلیمی اداروں اور گھروں میں تربیت کی کمی عدم برداشت کا سبب بنتی ہے۔ جب دانش گاہوں اور گھروں میں بچوں کو رواداری، اختلافِ رائے کا احترام اور برداشت کا سبق نہیں دیا جاتا تو یہی بچے آگے چل کر عدمِ برداشت کے رویوں کو اپناتے ہیں۔

(۲) فرقہ واریت

مسالک اور مکاتبِ فکر کے درمیان فکری اختلافات اسلام کی علمی روایت کا حصہ رہے ہیں، لیکن آج انہی اختلافات کو افتراق، گالی اور تکفیر میں بدل دیا گیا ہے۔ امام شاطبیؒ کے مطابق شریعت میں اختلافِ رائے کی گنجائش ہے اور تمام اہلِ علم نے اختلاف کو جائز تسلیم کیا ہے۔ (الموافقات، ۵: ۶۶)

مسلکی تعصب، فتویٰ بازی اور دوسرے مکاتبِ فکر کے لیے نفرت انگیز زبان کا استعمال عدمِ برداشت کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔ کچھ مذہبی عناصر بعض اوقات سیاسی یا ذاتی مفاد کے لیے اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں حالانکہ تعلیمات نبوی میں سختی کے بجائے میانہ روی اختیار کرنے کا حکم ہے۔

اہل علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اختلافات کو نفرت کا ذریعہ بنانے کے بجائے علمی تنوع کے طور پر اپنائیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (الأنعام، ٦: ١٥٩)

”بے شک جن لوگوں نے (جدا جدا راہیں نکال کر) اپنے دین کو پارہ پارہ کر دیا اور وہ (مختلف) فرقوں میں بٹ گئے، آپ کسی چیز میں ان کے (تعلق دار اور ذمہ دار) نہیں ہیں۔“

مسلکی اختلاف کو امت کے بگاڑ کا ذریعہ نہ بنایا جائے، بلکہ حکمت سے اختلاف کو قبول کیا جائے۔

(۳) عدالتی نظام کی کمزوری اور سماجی ناانصافی

عدم برداشت کی اسباب میں سے ایک بڑی وجہ عدالتی انصاف کی عدم دستیابی بھی شامل ہے۔ جب افراد کو قانونی راستوں سے حق ملنے کی امید نہ رہے تو وہ غصہ، انتقام اور جذباتی شدت پسندی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ۔ (النساء، ۴: ۵۸)

”بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں انہی لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و اِنصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معروف قول ہے:

”ریاست کفر پر تو قائم رہ سکتی ہے، مگر ظلم پر نہیں۔“

عدل کی غیر موجودگی نفرت کو بڑھا کر معاشرے میں شدت پسندی کو جنم دیتی ہے۔

اسی طرح معاشرتی عدم برداشت کی ایک بنیادی وجہ سماجی ناانصافی بھی ہے۔ جب تعلیم، انصاف، ملازمت اور عزت صرف اشرافیہ کو میسر ہو تو نچلے طبقے کے دل میں نفرت اور ردعمل جنم لیتا ہے۔

(۴) سیاسی مفادات اور گروہی تقسیم

سیاسی وابستگیاں اور مفادات بھی معاشرتی عدم برداشت کا ایک اہم سبب ہے۔ سیاسی قائدین کی زبان اور انداز اکثر جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے حامیوں کو نہ صرف برداشت نہیں کیا جاتا بلکہ نفرت اور دشمنی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جب سیاسی قیادت الزام تراشی اور تحقیر کا رویہ اپناتی ہے تو عوام میں بھی برداشت کا فقدان بڑھ جاتا ہے۔

(۵) سوشل میڈیا کا منفی کردار

عصرِ حاضر میں سوشل میڈیا نے جہاں معلومات کے دروازے کھولے، وہیں الزام تراشی،

کردار کشی اور جھوٹی خبروں کے فروغ نے معاشرتی فضا کو زہریلا کر دیا ہے۔ یہاں ہر فرد خود کو سچائی کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے اور اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھتا ہے۔ اسلامی اصول تو یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ۔

”اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق (شخص) کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو (ایسا نہ ہو) کہ تم کسی قوم کو لاعلمی میں (ناحق) تکلیف پہنچا بیٹھو، پھر تم اپنے کیے پر پچھتاتے رہ جاؤ۔“ (الحجرات، ۴۹: ۶)

لوگ سوشل میڈیا پر بلا تحقیق ردعمل دیتے ہیں جس سے غیظ و غضب اور عدم برداشت کا کلچر فروغ پا رہا ہے۔ اگرچہ اظہارِ رائے کی اہمیت مسلم ہے مگر بے جا الزام تراشی کسی دور میں بھی قابلِ تحسین نہ رہی بلکہ باعثِ ندامت رہی ہے۔ ڈیجیٹل دنیا میں اخلاقی اصولوں کی عدم موجودگی نے عدم برداشت کو عام کر دیا ہے۔

(۶) لسانی و نسلی تعصب و محاذ آرائی

لسانی و نسلی تعصب بھی عدم برداشت کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے حالانکہ قرآن ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے کہ قوموں میں تنوع کا مقصد تعارف ہے، تصادم نہیں:

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا۔ (الحجرات، ۴۹: ۱۳)

”اور ہم نے تمہیں (بڑی بڑی) قوموں اور قبیلوں میں (تقسیم) کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔“

اس قرآنی اصول کے برخلاف آج لوگ رنگ، نسل، عقیدہ، فرقہ اور مسلک کی بنیاد پر ایک دوسرے کا رد کر رہے ہیں۔ حضور نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان فرمایا:

”کسی عربی کو عجمی پر، اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ سے۔“ (مسند احمد، ۵: ۴۱۱، ۲۳۵۳۶)

(۷) خانقاہی نظام کا زوال

برصغیر میں صوفیاء کرام نے صدیوں تک سماجی برداشت کو پروان چڑھایا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، داتا گنج بخشؒ اور دیگر اولیاء کرام کی خانقاہیں امن، محبت اور برداشت کے مراکز تھیں۔ امام ابوالقاسم قشیریؒ نے أبو سليمان الداراني کا قول نقل کیا ہے کہ:

افضل عمل اپنے نفس کی خواہشات کی مخالفت ہے۔

(الرسالہ القشیریہ، ۱: ۶۱)

جب خانقاہی نظام کمزور ہوا تو روحانی برداشت کی ثقافت بھی کمزور پڑ گئی اور پھر اس نے بھی معاشرے میں عدم برداشت کے ماحول کو جنم دینے میں کردار ادا کیا۔

عدم برداشت کے اثرات

معاشرے میں ان وجوہات کے سبب پیدا ہونے والے عدمِ برداشت نے معاشرے کو کن خرابیوں سے دوچار کیا؟ ذیل میں ان اثرات کا جائزہ درج کیا جا رہا ہے:

(۱) اجتماعی وحدت کی تباہی

آج مسلم معاشروں میں قومیت، زبان، قبیلہ اور رنگ کی بنیاد پر جو تعصب پایا جاتا ہے، وہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ باہمی اعتماد کی جڑوں کو بھی کاٹ دیتا ہے۔ امّت جو ''جسدِ واحد'' تھی، عدم برداشت کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئی۔ پشتون، بلوچ، سندھی، مہاجر، پنجابی جیسے الفاظ کو نفرت یا سیاسی شناخت کی علامت بنا دیا گیا۔ مسجدیں اور مدارس قومیت یا فرقے کی بنیاد پر چل رہی ہیں۔ ملازمتوں کے لئے، تعلیمی اداروں اور سیاسی پلیٹ فارمز پر ''اپنا بندہ'' تلاش کیا جاتا ہے جو معاشرتی عدم برداشت کا واضح اثر ہے۔

(۲) تشدد اور نفرت انگیزی

عدم برداشت ایک ایسا زہر ہے جو معاشرے کو فرقوں، قوموں، زبانوں اور طبقات میں بانٹ دیتا ہے۔ افراد ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور دشمن بن جاتے ہیں۔ نتیجتاً باہمی تعاون، بھائی چارہ اور ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے۔ عدم برداشت کی کیفیت رفتہ رفتہ غصے، لڑائی، گالی گلوچ اور یہاں تک کہ قتل و غارت تک جا پہنچتی ہے۔ مذہبی، لسانی یا نظریاتی اختلاف پر تشدد کے واقعات اسی کی علامت ہیں۔ قرآن نے بار بار اختلاف کو علمی بنیادوں پر سلجھانے کا حکم دیا ہے:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔ (النحل، ۱۶: ۱۲۵)

''(اے رسولِ معظّم!) آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے بحث (بھی) ایسے انداز سے کیجئے جو نہایت حسین ہو۔''

(۳) علمی و فکری جمود

آج معاشرے میں اختلاف رائے کو دشمنی سمجھا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں، سوشل میڈیا اور مساجد میں بھی دوسروں کے نظریات کو برداشت کرنا ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ جب معاشرہ تنقید کو برداشت نہ

کرے تو نئی سوچ، تحقیق، مکالمہ اور تخلیق کا عمل رک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے معاشرے علمی پسماندگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

(۴) ذہنی اضطراب اور عدمِ تحفظ کا احساس

جہاں فرد کو ہر لمحہ یہ خطرہ لاحق ہو کہ اس کی رائے پر حملہ ہو گا، وہاں سکون، امن اور اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور ایک مستقل ذہنی دباؤ معاشرے پر طاری ہو جاتا ہے۔ عدم برداشت کے نتیجے میں مذہبی اور لسانی سانحات اور انسانیت سوز واقعات رونما ہوتے ہیں۔

تدارک کا لائحہ عمل

معاشرتی عدمِ برداشت کے اسباب و اثرات کے اجمالی جائزہ کے بعد آیئے اب اس عدمِ برداشت کے تدارک کے لیے لائحہ عمل پر غور کرتے ہیں جس کو اپنانے سے ہم اس رویہ اور مزاج سے نجات پا سکتے ہیں:

(۱) قرآن و سنت کی روشنی میں برداشت کا فروغ

رسول اکرم ﷺ کی سیرت برداشت اور رواداری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے منافقین، مشرکین اور یہاں تک کہ یہودیوں سے بھی حسنِ سلوک رکھا۔ میثاق مدینہ ایک عملی ماڈل تھا جس میں مختلف قبائل، مذاہب اور ثقافتیں ایک ہی سیاسی اکائی میں پرامن طور پر رہتی تھیں۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ ﷺ کو بدلہ لینے کا پورا اختیار تھا، تو آپ ﷺ نے ان قرآنی الفاظ کو بیان فرمایا:

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ (یوسف، ۱۲: ۹۲)

”آج کے دن تم پر کوئی ملامت (اور گرفت) نہیں ہے۔“

اور پھر آپ ﷺ نے اعلان فرمایا:

”جاؤ، تم سب آزاد ہو!“ (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام)

یہ اس معاشرتی برداشت کی عظیم ترین مثال ہے جو طاقت کے باوجود معاف کرنا سکھاتی ہے۔

عدم برداشت اکثر اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب انسان اپنا نفسیاتی خوف خارجی دشمنوں پر منتقل کرتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ میں غصے سے بچنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا:

لَا تَغْضَبْ ”غصہ نہ کرو۔“

(صحیح بخاری، کتاب الأدب، بَابُ الحَذَرِ مِنَ الغَضَبِ: ٦١١٦)

اللہ تعالیٰ نے صبر، عفو، اور تحمل کو اعلیٰ صفات میں شمار کیا ہے:

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ۔ (الشوریٰ، ۴۲: ۳۷)

"اور جو لوگ کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب انہیں غصّہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔"

امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں اخلاقِ حسنہ کی چار بنیادی صفات اور اصول بیان کئے ہیں:

۱۔ حکمت ۲۔ شجاعت ۳۔ عفت ۴۔ عدل

عدل سے مراد انسان کی وہ متوازن باطنی قوت ہے جو غصہ اور خواہش دونوں کو عقل و حکمت کے تابع کر دے۔ یعنی انسان جب اپنے نفس کو قابو میں رکھے، وہی دراصل اخلاق کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ (احیاء علوم الدین، ۳: ۵۴)

(۲) نصابِ تعلیم میں برداشت کی تربیت

موجودہ مسلم دنیا میں عدم برداشت کی ایک بڑی جڑ علمی و فکری کمزوری ہے۔ کبھی مسلم معاشرہ کتاب، مکالمہ، اجتہاد اور حکمت کا امام تھا۔ بغداد، قرطبہ، نیشاپور اور دہلی جیسے مراکز علم نے انسانیت کو ہزارہا فکری موتی دیے۔ اسلام کا اصل علمی ماڈل فہم، مکالمہ، غور و فکر اور تحقیق پر قائم ہے۔ آیات بینات سے واضح ہوتا ہے کہ فہم و فکر، سوال و جستجو اور تحقیقی رویہ اسلامی علم کا جوہر ہیں۔

مگر آج حال یہ ہے کہ مدارس میں متن کی حفظ پر زور ہے، فکر و تنقید کا فقدان ہے۔ مکاتب فکر کے درمیان علمی مناظرے کی جگہ ذاتی الزام تراشی نے لے لی ہے۔ دلیل سے بات کرنے والے ناپید اور نعرے لگانے والے ہر جگہ موجود ہیں۔ اس لیے نصاب تعلیم میں ایسی اصلاحات ضروری ہیں جو محض معلومات نہ دے بلکہ اخلاقی تربیت، تنقیدی سوچ اور رواداری کا شعور بھی دے۔ نصاب میں اختلاف رائے کے ادب، مکالمہ اور سماجی ہم آہنگی کے اسباق کو شامل کیا جائے جو اختلاف کی قبولیت، اور بین المذاہب و بین المسالک احترام کو فروغ دیں۔

(۳) بچوں کی تربیت میں شدت سے اجتناب

والدین اور اساتذہ اکثر بچوں کی تربیت میں سختی اور جبر سے کام لیتے ہیں، جس سے بچوں میں بھی عدم برداشت، غصہ اور خود سری پیدا ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"نرمی جس چیز میں ہو، اسے زینت دیتی ہے، اور جس سے نکل جائے، اسے بدصورت کر دیتی ہے۔" (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فضل الرفق: ۲۵۹۴)

گھریلو ماحول کو محبت، صبر اور برداشت کی درسگاہ بنایا جائے۔ والدین بچوں کو سکھائیں کہ دوسروں کے عقائد و آراء کا احترام کیسے کیا جاتا ہے۔

(۴) مکالمہ، علمی مجالس اور بین المذاہب و ثقافت ہم آہنگی کا فروغ

علمی و فکری زوال کے نتیجے میں معاشرہ تقلیدی جمود اور ذہنی کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنے ''مسلک'' یا ''فرقے'' کے خلاف ہر بات گمراہی لگتی ہے۔ علمی اختلاف کو دشمنی اور سوال اٹھانے کو گستاخی سمجھا جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے مابین مکالمے کے لیے خصوصی ادارے قائم کیے جائیں جہاں اختلافات کو سمجھنے اور برداشت کی راہ نکالنے کی کوشش ہو۔ اختلاف رائے کے احترام اور علمی مباحثے کی فضا پیدا کی جائے، جہاں سوال کو گالی نہ سمجھا جائے۔ جس معاشرے میں علم و آگاہی نہ ہو وہاں عدم برداشت کا کلچر فروغ پاتا ہے اور معاشرہ مٹی کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ اہل علم اپنے خطبات اور بیانات میں محبت، رواداری اور وحدتِ امت کا پیغام دیں ۔ فرقہ واریت اور تعصب پر مبنی بیانات سے گریز کریں تاکہ نفرت اور تعصب کے بیج نہ بونے پائیں۔

اسلام نے اقلیتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین کی ہے، مگر آج ان کے خلاف تعصب اور نفرت آمیز رویے معاشرتی بگاڑ کا سبب ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جو کسی معاہد (ذمی) پر ظلم کرے گا، قیامت کے دن میں اس کا وکیل ہوں گا۔'' (ابو داؤد: ۳۰۵۲)

مدینہ منورہ میں حضور نبی اکرم ﷺ نے اوس و خزرج، یہود و نصاریٰ اور مہاجر و انصار کو ایک معاشرتی وحدت میں پرو دیا تھا۔ اسی سیرت کو آج کی مسلم قیادتوں کو اپنانے کی ضرورت ہے۔

(۵) سوشل میڈیا کی تربیت کا ضابطہ

اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ عوام میں سوشل میڈیا کے مثبت استعمال کا شعور اجاگر کیا جائے۔ سوشل میڈیا پر اخلاقیات، تحقیق اور ادب کو فروغ دیا جائے۔ جذباتی اشتعال انگیزی کے بجائے تحمل اور برداشت کو فروغ دیا جائے۔ بے بنیاد الزامات اور نفرت انگیزی پر سختی سے گرفت کی جائے۔

(۶) قانونی و عدالتی انصاف و اقدامات کی کلیدی اہمیت

عدالتوں میں انصاف کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے تاکہ لوگ اپنے حقوق کے لیے قانونی راستے اختیار کریں اور جذباتی انتقام یا غصے سے بچیں۔ عدم برداشت کی بنیاد پر پھیلنے

والے جرائم پر فوری، غیر جانبدارانہ اور مؤثر کارروائی ہو تاکہ معاشرے میں قانون کی بالادستی قائم ہو۔ ریاست اگر اپنے شہریوں کے ساتھ انصاف نہ کرے تو ردعمل کی صورت میں عدم برداشت، احتجاج، بغاوت اور شدت پسندی جنم لیتی ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء، ۴: ۵۸)

"اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و اِنصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔"

(۷) عالمی اسلامی اتحاد اور امت مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری

فرقہ واریت، لسانی و نسلی تعصب کی بنا پر عدم برداشت ایسا فکری اور تہذیبی ناسور ہے جس نے امتِ مسلمہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اگر ہمیں دوبارہ سیاسی وقار، روحانی بلندی اور عالمی سطح پر اتحاد قائم کرنا ہے، تو سب سے پہلے اپنے دلوں سے تعصبات کو مٹانا ہوگا تاکہ فکری اور سماجی اختلافات کے باوجود یکجہتی کا مظاہرہ کیا جاسکے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

"مؤمن کی مثال باہمی محبت، ہمدردی اور شفقت میں ایک جسم کی طرح ہے کہ اگر انسان کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارے جسم کو شب بیداری اور بخار کا احساس ہوتا ہے۔" (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تراحم المؤمنین وتعاطفھم وتعاضدھم: ۲۵۸۶)

تحریک منہاج القرآن کا عدمِ برداشت کے تدارک میں کردار

تحریک منہاج القرآن ایک بین الاقوامی، مذہبی، تعلیمی اور اصلاحی تحریک ہے، جس نے نہ صرف دین کی حقیقی تعلیمات کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ معاشرتی ہم آہنگی، برداشت اور رواداری کے فروغ میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ عدم برداشت اور تعصب کے خاتمے کے لیے تحریک کی علمی، نظریاتی اور عملی کوششیں امتِ مسلمہ اور معاشرہ کے دیگر طبقات کے درمیان امن و محبت کے فروغ کا باعث ہیں۔ تحریک منہاج القرآن کے قائد شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ نے بارہا حضور نبی اکرم ﷺ کی حسنِ معاشرت کو اپنی فکر کا بنیادی نکتہ قرار دیا ہے۔

تحریک منہاج القرآن نے مختلف علمی و تعلیمی پروگرامز کے ذریعے معاشرے میں برداشت اور بھائی چارے کی تعلیم کو عام کیا ہے۔ یہ تعلیمی سرگرمیاں معاشرتی تفریق اور تعصب کو ختم کرنے میں موثر کردار ادا کر رہی ہیں۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر طاہر القادری کی قیادت میں تحریک نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نظریاتی و روحانی اصلاح کو فروغ دیا ہے، ان کی کتابیں، خطبات اور لیکچرز خاص طور پر سماجی عدم برداشت کی وجوہات اور ان کے حل پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

تحریک منہاج القرآن عالمی سطح پر مختلف ممالک میں امن و رواداری کے لیے کام کر رہی ہے، جہاں مختلف ثقافتوں اور مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے احترام اور محبت کے ساتھ رہ سکیں۔ عالمی امن کے فروغ میں بھی تحریک کا نمایاں کردار ہے۔ تحریک کی تعلیمات اور خدمات نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ غیر مسلموں میں بھی رواداری، برداشت اور امن کا پیغام پہنچاتی ہیں، جو ایک ہم آہنگ، خوشحال اور پُرامن معاشرہ تشکیل دینے میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔

حاصل بحث

معاشرتی عدم برداشت ایک ایسا رویہ اور مزاج جسے اگر بروقت نہ روکا جائے تو معاشرے کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ یہ صرف ایک اخلاقی خرابی نہیں، بلکہ قومی وحدت، ترقی اور امن کے راستے کی رکاوٹ ہے۔ اس کا علاج صرف قانون سازی سے نہیں بلکہ سماجی، اخلاقی اور تعلیمی سطح پر ہمہ جہت جدوجہد سے ممکن ہے۔ ہمیں انفرادی، اجتماعی، تعلیمی، دینی اور قانونی ہر سطح پر اس کے خلاف شعوری جدوجہد کرنی ہوگی۔ اگر ہم برداشت کو اپنائیں، تو نہ صرف ہمارے سماجی تعلقات بہتر ہوں گے بلکہ بحیثیت قوم ہماری بقا بھی محفوظ رہے گی۔ لہذا ضروری ہے کہ

۱۔ مذہبی و سیاسی قیادت رواداری کے عملی ماڈل پیش کرے۔ مساجد اور مدارس میں اعتدال پسندی اور باہمی احترام کے موضوعات پر خطبات ہوں۔

۲۔ بین المسالک و بین المذاہب مکالمے کو ادارہ جاتی سطح پر فروغ دیا جائے۔

۳۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے متعصب رویے سے گریز کریں۔ قانون سازی کے ذریعے منافرت پھیلانے والوں کو سزا دی جائے، اور قانون کا اطلاق ہر طبقے پر یکساں ہو۔

۴۔ نصابِ تعلیم میں برداشت، احترامِ اختلاف اور بین المسالک ہم آہنگی کو شامل کیا جائے۔ تعلیم میں تنوع اور مکالمہ کی تربیت دی جائے۔

۵۔ سوشل میڈیا کے لئے ضابطہ اخلاق مرتب کیا جائے، جو الزام تراشی اور نفرت انگیزی کو روکے۔

۶۔ سیاسی قائدین ایک ضابطۂ اخلاق پر متفق ہوں کہ قومی مفاد کو جماعتی مفاد پر ترجیح دی جائے۔

سینئر ریسرچ سکالر فریدِ ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

تعلیم و تحقیق سے بیگانگی: ایک سماجی المیہ

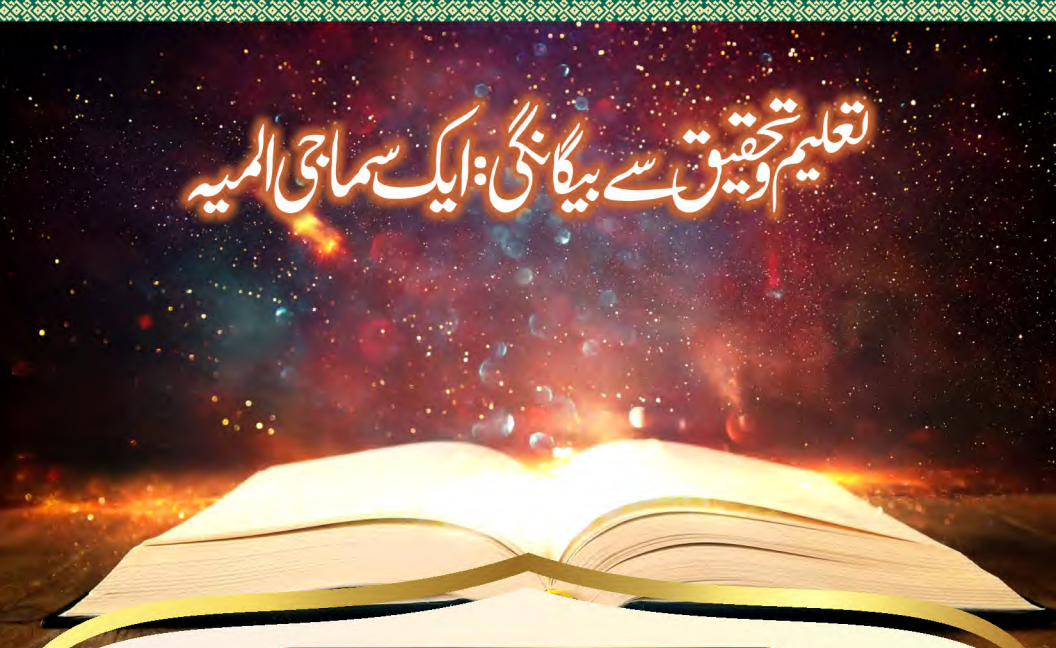

ڈاکٹر زہیر احمد صدیقی
ریسرچ سکالر فرید، ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور

تعلیم اور تحقیق کسی بھی معاشرے کی ترقی اور استحکام کی بنیاد ہیں۔ یہ وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعے انسان نہ صرف اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے بلکہ معاشرے کو بھی مثبت تبدیلیوں کی طرف گامزن کرتا ہے۔ تاہم، موجودہ دور میں تعلیم و تحقیق سے بے رغبتی ایک سنگین سماجی مسئلہ بن چکا ہے، جس کے اثرات محض فکری و اعتقادی پستی کی صورت میں ہی ظاہر نہیں ہو رہے بلکہ اضافتاً اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی میدانوں میں بھی واضح طور پر نظر آ رہے ہیں۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اپنی آفاقی تعلیمات میں علم و تحقیق کو کسی بھی معاشرے کی ہمہ جہتی ترقی کا ضامن قرار دیتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں علم و تحقیق سے بے اعتنائی و بے گانگی کو کسی بھی معاشرے کے زوال کا سبب قرار دیتا ہے۔ ذیل میں ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنے معین کردہ مضمون کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ہم وحی الٰہی سے رہنمائی لیتے ہوئے اپنے آج کو سنوار کر، اپنے کل کو منور و روشن کر سکیں:

تعلیم و تعلم کی ناگزیریت

اگر ہم کتاب و سنت کا بنظر غایر مطالعہ کریں تو ہم یہ بات بلا تامل جان سکیں گے کہ وحی الٰہی کسی بھی انسان کی انفرادی زندگی سے لے کر اس کی عائلی و خاندانی زندگی تک اور سماجی و معاشرتی زندگی سے

لے کر قومی و بین الاقوامی زندگی تک کے ہر مرحلے میں مسلسل تعلیم اور تحقیق کے سفر پر گامزن رہنے کی ترغیب و تلقین کرتی دکھائی دیتی ہے۔

قرآن مجید کی پہلی وحی کی صورت میں نازل ہونے والی سورۃ العلق کی ابتدائی آیات ہی حضرت انسان پر ''اِقْرَءْ'' کی صدائے دلنواز کے ذریعے محض تعلم کی ذمہ داری ہی نہیں ڈالتیں، بلکہ انسانی زندگی میں تعلیم و تعلم کے دوہرے رشتے کو بخوبی ثابت بھی کرتی ہیں۔ یاد رہے کہ تعلیم و تعلم ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں، اسی لیے قرآن مجید کے اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف معلم کے طور پر ان الفاظ میں کروایا:

''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ''

یعنی آپ اس کریم و اکرم رب کے نام سے پڑھیے کہ جس نے نہ صرف یہ کہ انسان پر احسان فرماتے ہوئے اسے عدم سے وجود بخشا، بلکہ احسان در احسان کرتے ہوئے بے علم انسان کو وہ وہ کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اگر ہم دقتِ نظری کے ساتھ فرمانِ عالی شان ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ'' پر رک کر غور و فکر کریں، تو ہم پر یہ بات بخوبی عیاں ہو جائے گی کہ جہاں فرمان مبارک: ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ''، انسان کو علم کے مراحل سے گزارنے کی الوہی مشیئت کی طرف صراحت سے دلالت کر رہا ہے، وہیں فرمان مبارک: ''مَالَمْ یَعْلَمْ''، حضرت انسان کی فطرت میں موجود تجسس، مزید سے مزید کا متلاشی رہنے اور نئے سے نئے کی جستجو اور تگ و دو کرتے رہنے کی صفت کو بھی واضح کر رہا ہے۔ عدمِ علم کا احساس، انسان کو علم و تحقیق کی طرف بڑھانے کا پہلا قدم ہے۔

اسی طرح معلم برحق، اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفی ﷺ کو کئی مقامات پر بطور معلم متعارف کروایا ہے۔ چنانچہ سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر ۱۲۹ میں فرمایا:

''وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ''

یہ نبی آخر الزمان ﷺ متلاشیانِ علم کو کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور حکمت و دانائی سکھاتے ہیں اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ تم میں متلاشیانِ علم و تحقیق کو ایسے ایسے اسرارِ معرفت و حقیقت سکھاتے ہیں جو تم نہ جانتے تھے۔

قرآن مجید میں مذکور حضور نبی اکرم ﷺ کی شانِ معلمیت امت کو اس امر کی جانب متوجہ کرتی ہے کہ محبوبِ دو عالم ﷺ کی اس شان سے کچھ نہ کچھ فیض پائیں اور اپنے آپ کو تادمِ حیات، ان کی اتباع میں رہتے ہوئے تعلیم و تعلم سے منسلک کیے رکھیں۔ نبی آخر الزماں ﷺ نے بھی بذاتِ خود اپنی

شان معلمیت کا اعلان ''إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' کے الفاظ سے فرمایا، اب ایسی صورت میں یہ بھلا کیوں کر ممکن ہے کہ امتی، اپنے آپ کو زندگی کے کسی مرحلے میں بھی تعلیم و تعلم سے جدا کر لے؟ اس سے بے اعتنائی برتے اور علم و تحقیق سے بے گانگی کا اظہار کرے؟

سماج میں تحقیق و جستجو کی اہمیت

قرآن مجید، احادیث مبارکہ اور اقوال و آثار سے تحقیق کی اہمیت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ قرآن مجید کی مذکورہ آیات میں جہاں تعلیم کا ذکر آیا، وہاں ''مَالَمْ یَعْلَمْ'' اور اسی طرح ''مَالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ'' کے الفاظ اس بات کے عکاس ہیں کہ حضرت انسان کے اندر مجہول و ناآشنا کی معرفت کی جستجو ودیعت کر دی گئی ہے۔ یہ الفاظ اس بات کو بھی بخوبی سمجھا دیتے ہیں کہ علم میں تحقیق کا دروازہ اسی شخص پر کھلے گا جو ''لَمْ یَعْلَمْ'' (کہ وہ نہیں جانتا) کا احساس اپنے اندر پیدا کرنے میں کامیاب رہے گا۔

قرآن مجید میں تحقیق کی نہ صرف اہمیت ذکر ہوئی ہے، بلکہ اس کی ترغیب بھی وارد ہوئی ہے۔ اب ذرا غور فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۵ میں ارشاد فرمایا:

''وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلًا''

یعنی اے لوگوں تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

یہ آیت انسانی علم کے قلیل ہونے پر نصِ صریح ہے۔ یہ آیت انسان کے اندر مزید جستجو کو زندہ کرتی ہے اور اس بات کا احساس پیدا کرتی ہے کہ اے انسان تو علم کی جس بھی بلندی تک پہنچ جائے، تیرا علم ابھی قلیل ہی ہے، تجھے ابھی مزید تحقیق کرنی ہے، مزید علم حاصل کرنا ہے، نئے حقائق تک رسائی حاصل کرنی ہے اور اس کائنات کو تسخیر کرنا ہے۔ لہذا یہ آیت مبارکہ انسان کے اندر تحقیق کی جستجو کو زندہ کرتی ہے۔ اسے یہ احساس دلاتی ہے کہ اسے اپنے علم پر اکتفاء نہیں کرنا، کیوں کہ اس کا علم ابھی نامکمل ہے۔ اسے مزید علم کے حصول کی طرف بڑھنا ہے۔

اب ذرا قرآن مجید ہی کے ایک اور مقام پر غور فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ یوسف کی آیت نمبر ۷۶ میں فرماتے ہیں:

''وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ''

یعنی کہ ہر صاحبِ علم سے اوپر بھی ایک علم والا ہوتا ہے۔

یہ آیت کریمہ بھی انسان کے اندر تحقیق و جستجو کے دروازے کھولتی ہے۔ انسان کو اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ اسے اپنے علم پر اکتفا نہیں کرنا، اسے مزید علم حاصل کرنا ہے، اشیائے موجودات اور ان کے

پنہاں رازوں کی نئی نئی جہات تک پہنچنا اور ان کو منکشف اور عیاں کرنا ہے۔ یقیناً یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ کوئی اپنے علم کو حرفِ آخر سمجھنا ترک نہ کر دے۔ کیوں کہ الوہی تعلیمات اسے بتلا رہی ہیں کہ اس کی معرفت جہاں بھی پہنچ جائے، اس سے بڑھ کر صاحبانِ معرفت موجود ہیں۔

سورۃ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۱۴ بھی انسان میں تعلیم و تحقیق کے دروازے کھولتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

''وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا''

اور آپ رب کے حضور یہ عرض کیا کریں کہ اے میرے رب مجھے علم میں اور بڑھا دے۔

زیادتِ علم، یعنی علمی کثرت کا تقاضا وہی شخص کرے گا جس کو اس کے نقصان یعنی کم ہونے کا ادراک ہو گا اور علم کے نقصان کا احساس اسی کو ہو گا جو اپنے علم کو حرفِ آخر قرار دینے کی بجائے اپنے رب کے حضور متواضع، عاجز اور منکسرِ نفس رہتے ہوئے اپنی کم علمی، کج فہمی، بے مائیگی اور بے بضاعتی کا اقرار و اعتراف کرتا ہو۔

یہاں ضمناً یہ مفہوم بھی واضح ہو گیا کہ صرف ایسا محقق شخص ہی معاشرے میں صحیح معنٰی میں نافع بن سکتا ہے جو اپنی طبیعت میں عاجز اور متواضع رہتے ہوئے تحقیق کے میدان میں آگے بڑھے۔ معاشرے میں بسنے والا ہر فرد جس کی تحقیق رعونت کا باعث بنے، قدرت اسے معاشرے میں تعمیری کردار ادا کرنے کی نعمت سے محروم کر دیتی ہے۔

تعلیم و تحقیق سے بے گانگی ایک سماجی المیہ کیسے؟

ہمیں سب سے پہلے اس بات کو ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ وحی الٰہی کی تعلیمات ہم سے متقاضی ہیں کہ ہم ایک ایسا سماج اور ایسا معاشرہ قائم کریں جس کا سہرا علم و تحقیق سے سجا ہو، نہ کہ جہالت و ناخواندگی کی ظلمت میں ڈوبا ہوا یا غیر مصدقہ اندازوں اور خیالات کے غبار سے اٹا ہوا۔ یہی امتیاز اللہ رب العزت نے سورۃ زمر کی آیت نمبر ۹ میں استفہام برائے تقریر کے اسلوب میں فرمایا:

''قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ''

یعنی فرما دیجئے: کہ کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو لوگ علم نہیں رکھتے، سب برابر ہو سکتے ہیں؟ بس نصیحت تو عقل مند لوگ ہی قبول کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو گئی کہ ہر وہ سماج اور معاشرہ جو علم و تحقیق سے عاری ہو گا، وہ دنیوی اعتبار سے تو پستی کا شکار ہو گا ہی، علاوہ اس کے وہ عند اللہ بھی اپنا مقام و مرتبہ اور وقار و اہمیت کھو دے گا۔ لہٰذا کسی بھی سماج کا علم و تحقیق سے عاری ہونا اور تعلیم و تعلم اور تحقیق کے میدان سے بے

گانگی ظاہر کرنا بالیقین کسی بڑے المیہ سے کم نہیں۔

ہمیں ایک دوسرا پہلو بھی نظر میں رکھنا چاہیے اور وہ یہ کہ معاشرے کا علم و تحقیق سے بیزار اور بے گانہ ہونا، قربِ قیامت کی علامات میں سے بھی ہے۔ اس اعتبار سے تعلیم و تحقیق سے بے گانگی ایک بڑا سماجی المیہ قرار پائے گا۔

صحیح بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ روایت میں ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ بين يَدَيْ السَّاعَةِ لأَيَّامًا يَنْزِلُ فيها الْجَهْلُ وَيُرْفَعُ فيها الْعِلْمُ۔ (أخرجه البخاري في الصحيح، كتاب الفتن، باب: ظهور الفتن، ٦: ٢٥٩٠، الرقم: ٦٦٥٣)

یعنی قیامت کے قریب ایسے ایام بھی آئیں گے جب معاشرے میں جہالت اتر آئے گی اور وہاں سے علم، تعلیم و تعلم کو اٹھا لیا جائے گا۔

اس حدیث کی رو سے سماج سے علم و تحقیق کا اٹھا لیا جانا، قربِ قیامت کی دلیل ٹھہرا، جو کہ ہر ذی شعور کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس باب میں جو روایت آئی ہے، وہاں الفاظ کچھ اس طرح سے ہیں:

أَنْ يُرْفَعَ الْعِلْمُ وَيَثْبُتَ الْجَهْلُ۔ (خرجه البخاري في الصحيح، كتاب العلم، باب: رفع العلم وظهور الجهل، ١: ٤٣، الرقم: ٨٠)

سماج سے علم کا نور اٹھا لیا جائے گا اور وہاں بسنے والے افراد میں جہالت ثبت ہو جائے گی۔

معلوم ہوا کہ معاشرے سے علم کا اٹھا لیا جانا اور جہالت کی کثرت کا ہو جانا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ قربِ قیامت معاشرے سے تعلیم و تحقیق سے بے گانگی اور لاتعلقی بکثرت نظر آئے گی۔

تعلیم و تحقیق سے بے گانگی کے سماجی اثرات

ہمیں یہ بات ہر گز ذہن سے نہیں نکالنی چاہیے کہ جس معاشرے میں بھی علم، تعلیم و تعلم اور تحقیق کے دروازے بند ہو جائیں گے وہ معاشرہ یقینی اور لازمی طور پر کئی طرح کے فسادات کا شکار ہو جائے گا۔ ایسے معاشرے سے علم تو رفع ہو گا ہی، اس کے ساتھ ساتھ وہاں فکری پستی، اعتقادی بے راہ روی، احکامِ شریعت سے ناواقفیت اور طرح طرح کے جرائم کا ارتکاب ہو گا۔ ایسا معاشرہ عدمِ برداشت کا شکار ہو جانے کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو جائے گا جو یقیناً اس کے زوال کا سبب بنیں گی۔ یوں تو تعلیم و تحقیق سے بے گانگی کے بہت سے مضرات و اثرات ہیں، مگر ہم یہاں چیدہ چیدہ اثرات کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) جہالت کا غلبہ

جو معاشرہ تعلیم و تحقیق سے بے رخی دکھائے گا، وہاں جہالت راج کرے گی۔ لوگ جہلاء کے طبقے کو اعلیٰ مناصب اور سیادت دیں گے۔ ایک حدیث پاک میں حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن اللهَ لا يقبضُ العلمَ انتزاعا يَنتزعه من العباد، ولكن يقبضُ العلمَ بقبضِ العلماءِ حتى إذا لم يُبْقِ عَالمًا اتخذَ النَّاسُ رؤوسًا جُهَّالا، فسُئلوا، فأفتَوا بغيرِ علم، فضَلُّوا وأَضَلُّوا۔

(أخرجه البخاري في الصحيح، كتاب العلم، باب: كيف يقبض العلم، ۱: ۵۰، الرقم: ۱۰۰)

بے شک اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں کے سینوں سے یکایک نکال کر نہیں اٹھاتے، بلکہ علم کو علماء کے اٹھائے جانے کے ذریعے اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہے تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے۔ ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، نتیجتاً خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

لہٰذا ہم بڑے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ معاشرے کو علم و تحقیق سے عاری کرنا، جہالت کے سپرد کرنا ہے، جو یقیناً ایک بڑا المیہ ہے۔ امام بدر الدین عینی صحیح بخاری کی معروف شرح عمدۃ القاری میں اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا:

وقد وُجد ذلكَ في زماننا؛ كما أخبرَ به عليه الصَّلاة والسَّلام

یہ بات ہمارے زمانے میں ویسی ہی پائی جاتی ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے خبر دی تھی۔

پھر فرمایا: شیخ قطب الدین رحمہ اللہ کہتے ہیں:

قلت: هذا قوله مع توفُّر العلماء فی زمانه، فکیف بزماننا

میں کہتا ہوں کہ امام قاضی عیاض نے یہ بات اپنے زمانے میں کہی تھی، جب کہ اُس وقت بھی بڑی تعداد میں علماء موجود تھے۔ پھر ہمارے زمانے کا کیا حال ہوگا؟!

امام عینی مزید فرماتے ہیں:

هذا قولُه معَ کثرةِ الفقهاء والعُلماء مِن المذاهبِ الأربعَة والمحدِّثين الکبار فی زمانه، فکيفَ بزماننا الّذی خَلَتِ البلادُ عنهم، وتصدَّرتِ الجُهّالُ بالإفتاء، والتَّعيُّنِ فی المجالس، والتَّدريس فی المَدارس؟ فنسأل السَّلامة والعَافية۔

یہ بات انہوں نے اس وقت کہی تھی جبکہ ان کے زمانے میں مذاہب اربعہ کے بڑے فقہاء اور نامور محدثین موجود تھے۔ پھر ہمارے اس زمانے کا کیا حال ہوگا جب شہروں سے ایسے علماء ختم ہو چکے ہیں اور جاہل لوگ فتویٰ دینے، مجالس میں سربراہ بننے اور مدارس میں تدریس کے مناصب پر فائز ہونے لگے ہیں؟ ہم اللہ سے سلامتی اور عافیت کی دعا کرتے ہیں۔

(۲) محرمات کا ارتکاب

جس معاشرے میں علم و تحقیق سے بے اعتنائی برتی جائے گی وہاں نتیجتاً جہالت پھیلے گی، اور جہالت کا نتیجہ محرمات کے ارتکاب کی صورت میں ہوگا۔ علمی جہالت، رویوں کی جہالت میں بدلے گی اور نتیجتاً لوگ بڑے بڑے شرعی جرائم کے مرتکب ہوں گے، حلال و حرام میں حدِ فاصل نہ رہے گی۔ لوگ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیں گے۔ سچ کی جگہ جھوٹ لے لے گا۔ لوگ جھوٹی گواہیاں دیں گے۔ ایسے شنیع شرعی جرائم کا معاشرے میں راج ہونے کے سبب لوگ عبادت کریں گے، مگر وہ پر اثر نہ ہوگی، لوگ دعائیں کریں گے، مگر قبول نہ ہوں گی۔

تعلیم و تعلم اور تحقیق سے بے گانگی کے وہ اثرات جو براہ راست معاشرے اور سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے، ان میں محرمات کا ارتکاب سر فہرست ہے، اسی کے سبب لوگوں کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔

ایسے شخص کے عمل کی بھی اللہ کو چنداں حاجت نہیں رہتی، ظاہری سی بات ہے، جب تعلیم و تعلم اور بحث و تحقیق ہی معاشرے میں نہ رہی، اور علم کے ثمرات معاشرے میں بسنے والے افراد کے مزاج، طبائع اور رویوں کو سیراب نہ کر سکے تو محض ظاہری دکھلاوے کے عمل کی اللہ کو بھلا کیا حاجت؟ اسی لیے ایک حدیث پاک میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالعَمَلَ بِهِ، وَالجَهْلَ، فَلَيسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ۔ (أخرجه البخاري في الصحيح، كتاب الأدب، باب: (قول الله تعالى) واجتنبوا قول الزور، ۵: ۲۲۵۱، الرقم: ۵۷۱۰)

سماج کا کوئی فرد اگر جھوٹ بولنا نہ چھوڑے، جھوٹ پر عمل نہ چھوڑے، جہالت ترک نہ کرے، تو اللہ کو حاجت نہیں کہ وہ اس کا نام لے کر کھانا پینا چھوڑ رکھے۔

اہل علم فرماتے ہیں کہ یہاں جس جہالت کے ترک کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اس میں جہالت کی جملہ صورتیں شامل ہیں۔ لہذا جملہ صفاتِ جہل، احوالِ جہل اور جملہ معاصی کا ارتکاب عمل بالجہل ہی کے ذیل میں ہے جس کو ترک کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کو تعلیم دینے کی غرض سے، اپنی دعا میں جہل اور اس کی جملہ صورتوں سے پناہ طلب فرمایا کرتے تھے۔ ایک حدیث مبارک میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں:

مَا خَرَجَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنْ بَيْتِي قَطُّ، إِلَّا رَفَعَ طَرْفَهُ إِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ، إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ، أَوْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ، أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ، أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ۔

(أخرجه ابوداؤد في الصحيح، كتاب الأدب، باب: باب ما جاء فيمن دخل بيته ما يقول، ۴: ۳۲۵، الرقم: ۵۰۹۴)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی بھی میرے گھر سے باہر تشریف لے جاتے، آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے، اور یہ دعا پڑھتے: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میں خود گمراہ ہو جاؤں یا کسی کو گمراہ کروں، میں خود لغزش کروں یا مجھے لغزش پر ڈالا جائے، میں خود ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے، میں خود جہالت کروں یا مجھ پر جہالت کی جائے۔

علامہ مناوی فیض القدیر میں فرماتے ہیں:

أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ، أي: أفعل بالناس فعل الجهّال من الإيذاء والإضلال۔

حضور اکرم ﷺ نے یہ جوار شاد فرمایا: ''أَو أَجهلَ أو يُجهلَ عَلَيَّ''، اس سے مراد ہے کہ یا میں خود جاہلوں جیسا برتاؤ کروں (جیسے تکلیف دینا یا گمراہ کرنا)، یا لوگ مجھ سے جاہلانہ سلوک کریں (یعنی مجھے ضرر پہنچائیں یا گمراہ کرنے کی کوشش کریں)۔

نیز فرمایا: ''ويُحتمل أن يُراد بقوله: أجهل أو يُجهل عليّ؛ الحالُ الذی كانتِ العربُ عليها قبلَ الإسلام منَ الجَهل بالشرائع والتّفاخُر بالأنساب، والتّعاظُم بالأحسابِ والكِبرياءِ والبَغيِ ونحوها''

اور یہ بات بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ کے فرمان: ''أجهل أو يجهل علی'' سے مراد وہ حالت ہو جس پر عرب اسلام سے پہلے تھے، یعنی شرعی احکام سے ناواقفیت، نسب پر فخر کرنا، خاندانی حسب و نسب پر تکبر، غرور و تکبر، ظلم و زیادتی اور اسی قسم کی دیگر جاہلیت کی صفات۔

لہذا، جس سماج کو علم و تحقیق خیر باد کہہ دے اور وہاں سے رخصت ہو جائے، ایسے معاشرے میں جہل اپنی جملہ صورتوں کے ساتھ راج کرتا ہے۔ امام ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں، ایک حدیث جس میں جہل کے بکثرت پھیل جانے کا ذکر ہے، اس پر کلام فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''أن هذا النوع مِن الجَهل هُو: الجَهل الصّرف، الّذی يستحكم فی الأمة، فيُلازم نزولَه كثرةَ الفتن والاختلاف والقتل''

اس قسم کے جہل سے مراد خالص جہالت ہے جو امت میں اس قدر پھیل جاتی ہے کہ اس کے نتیجے میں فتنوں، اختلافات اور قتل و غارت گری میں شدت آجاتی ہے۔

قارئین محترم! معاشرے میں علم و تحقیق سے بے اعتنائی برتنے کے مضرات کیا کیا ہیں؟ انفرادی ظاہری و باطنی امراض سے لے کر عائلی و خاندانی مسائل تک، سماجی و معاشرتی مصائب سے لے کر، قومی و بین الاقوامی مشکلات تک، ہر مرحلۂ حیات میں اس کے اثرات دکھائی دیں گے۔ مستزاد یہ کہ علم و تحقیق سے یہ بے گانگی، نہ صرف فکر و نظر اور اعتقاد کو گرد آلود کرتی ہے بلکہ اخلاقی و روحانی اقدار کا بھی جنازہ اسی سبب نکلتا دکھائی دیتا ہے۔

اس باب میں کہنے اور لکھنے کو بہت کچھ ہے۔ جو کچھ بھی کہا یا لکھا گیا، اس کا مآل و منتہی ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ تعلیم و تحقیق سے دوری ایک سماجی المیہ ہے۔ جس سے معاشرہ سوائے تباہی کے کچھ حاصل نہیں کرتا۔ ہمیں اپنی نئی نسل کو علم اور تحقیق کی طرف راغب کرنا ہوگا، تب ہی ہم ایک مستحکم اور ترقی یافتہ معاشرہ قائم کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالی کے حضور دعا ہے کہ وہ ہمیں علم و تحقیق سے منسلک رکھے اور اس کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اس پر حقیقی معنی میں عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

خانقاہی نظام اور منہاج القرآن کا تجدیدی کردار

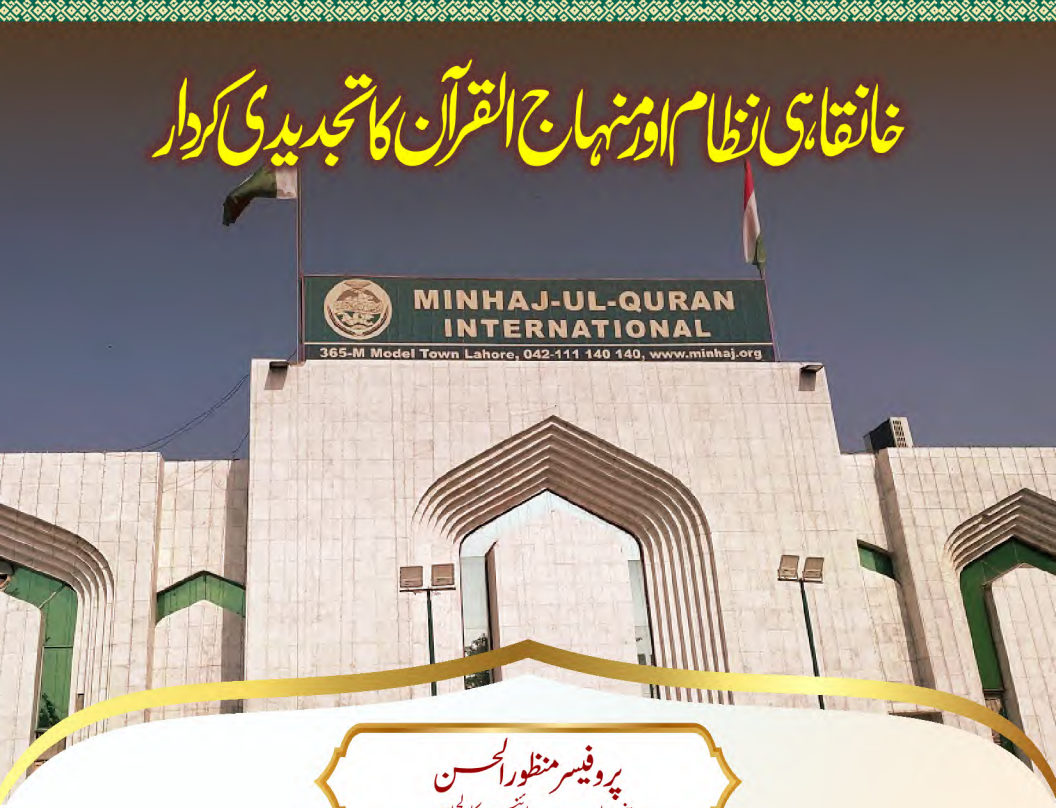

پروفیسر منظور الحسن
پنجاب سائنس کالج لاہور

خانقاہ۔۔۔ ایک ایسا مقدس آستانہ ہے جہاں زمین کی خاک میں آسمان کا نور اترتا ہے۔ یہ صرف اینٹ اور گارے کی عمارت نہیں، بلکہ دلوں کی تربیت گاہ، روحوں کی تطہیر کا مرکز اور کردار سازی کی آغوش ہے۔ یہاں نہ خطبوں کی گھن گرج ہے، نہ منبروں کی چمک، صرف خاموشی ہے۔۔۔ مگر ایسی خاموشی جس میں دل بولتے ہیں، آنکھیں سیکھتی ہیں اور روحیں سجدہ ریز ہوتی ہیں۔

خانقاہ۔۔۔ وہ مقام ہے جہاں مرشد کی ایک نظر، سالک کے دل کی گرد جھاڑ دیتی ہے۔ جہاں قال سے زیادہ حال کی قدر ہے اور جہاں ہر آنے والا، ''میں'' کو ''تو'' میں ڈھال کر لوٹتا ہے۔ یہاں نہ ذات پات کی دیوار ہے، نہ علم و جاہ کا غرور۔۔۔ صرف اخلاص کا دریا ہے، جس میں ہر دل غوطہ زن ہو کر، بندگی کی لذت سے آشنا ہوتا ہے۔

خانقاہ۔۔۔ وہ آستانہ ہے جہاں قال کی جگہ حال کو، اور ظاہری علم کی جگہ باطنی مشاہدے کو وقعت دی جاتی ہے۔ یہاں دلوں کو جگایا جاتا ہے، نفس کو قابو میں کیا جاتا ہے اور محبتِ الٰہی کی چنگاری کو شعلہ بنایا جاتا ہے۔۔۔ خانقاہ نہ عبادت گاہ ہے، نہ مدرسہ، نہ دربار۔۔۔ یہ ان سب کا جامع روحانی مرکز ہے، جہاں مرشدِ کامل دل کی الجھنیں سلجھاتا ہے، زبان سے کم اور نگاہ سے زیادہ بات کرتا ہے۔ یہاں ذکر میں گریہ ہے، مراقبے میں معرفت ہے اور خلوت میں قربت ہے۔

خانقاہ کا مقصود صرف تزکیہ نہیں، بلکہ بندگی کے آداب سکھانا اور تسلیم و رضا کا وہ رستہ دکھانا بھی ہے، جہاں سالک اپنے رب کے رنگ میں رنگا جائے۔ یہیں سے وہ فقر جنم لیتا ہے جس کی آنکھ میں نہ تختِ سکندری کوئی حیثیت رکھتا ہے اور نہ دارا کا تاج شاہی کسی وقعت کا حامل ہوتا ہے۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

خانقاہ کی بنیاد دراصل اُس وقت رکھی گئی جب دنیا کی ہنگامہ خیزیوں میں ایک گوشۂ سکوت درکار ہوا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے غارِ حرا سے نکلنے والے نور نے جب باطنی جہاد کا آغاز کیا، جب نور نبوت کے سائے میں قلوب کی دنیا جگمگائی تو تصوف کی تخم ریزی کا مرحلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔ خلفائے راشدین کے دور میں جہاں عدل، علم اور جہاد کا غلبہ رہا، وہیں دلوں کے تزکیہ اور باطن کی صفائی کا چراغ بھی روشن رہا۔ یہی چراغ پھر تابعین، تبع تابعین اور بعد ازاں صوفیائے کرام کی مجالس میں مزید روشن ہوا۔

اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور اسلامی سلطنتیں بڑھتی گئیں، تب خانقاہیں ایک علیحدہ روحانی نظام کے طور پر ابھریں اور دلوں کو سنوارنے اور روحوں کو جگانے کا مرکز بنتی گئیں۔ خانقاہوں کے اس روحانی نظام نے صدیوں تک امت کے فکر و کردار کو سنوارا، نفس کو قابو میں رکھا اور دلوں کو سچائی کے عطر سے معطر کیا۔ یہ روحانی مراکز نہ سیاست کی آماج گاہ، نہ معیشت کا مرکز بل کہ روح کی تربیت گاہ تھے، جہاں ہر آنے والے کو اپنے رب سے لو لگانے کا سلیقہ سکھایا جاتا۔

بصرہ میں خواجہ حسن بصری اور امام ابن سیرین کا مرقد انور ہو۔۔۔ یا بغداد میں حضرت معروف کرخی اور حضرت جنید بغدادیؒ کی مجلس ہو۔۔۔ نیشاپور میں خواجہ بایزید بسطامیؒ کا آستانہ ہو یا گیلان کی سرزمین پر حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی خانقاہ پرانوار ہو۔۔۔ یہ سب وہ قندیلیں ہیں جن سے خانقاہی نظام کا دامن منور ہے اور جب یہ نظام سرزمین ہند میں وارد ہوا تو خواجہ غریب نواز، داتا گنج بخش، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، بابا فرید گنج شکر جیسے آفتاب و ماہتاب نے اسے جلا بخشی۔

خانقاہی نظام۔۔۔ علم و اخلاق اور روحانیت کا امتزاج

ہر خانقاہ علم و شعور، ذکر و فکر، اخلاق و تربیت اور خدمتِ خلق کا گلشن اور فیوضات روحانی کے لیے مرجعِ خلائق بنی رہی، جہاں نورِ معرفت اور دلوں کا سوز و گداز تقسیم ہوتا رہا اور طالبانِ حق اپنے دامنِ مراد کو گوہرِ مقصود سے مالا مال کرتے رہے۔ اب بھی یہ ایسی خلوت گاہیں ہیں، جہاں دل کی دنیا

آباد کی جاتی ہے۔۔۔ یہاں نفس کے فتنے بجھائے جاتے ہیں اور عشق الٰہی کی مشعل فروزاں کی جاتی ہے ۔۔۔ یہاں نہ حکمرانی کا دعویٰ، نہ خطابت کی نمائش۔۔۔ فقط ایک درویش کا در، فقط خاموشی سے دلوں میں روشنی انڈیلتا ہے۔

تاریخ کے صفحات میں جب ہم تصوف کے تابندہ نقوش تلاش کرتے ہیں تو خانقاہی نظام ایک روحانی تحریک کی صورت میں ابھرتا ہے۔ یہ محض ایک ادارہ نہیں، بلکہ ایک نظریہ، ایک طرزِ حیات اور ایک تہذیبی مرکز ہے، جس نے اہلِ ایمان کے سامنے علم، اخلاق، روحانیت اور معاشرت کا امتزاج پیش کیا۔ ان خانقاہوں نے صرف دلوں کی دنیا نہیں بدلی، بلکہ معاشرے کے تانے بانے بھی سنوارے۔ جب سلطنتوں میں فرقہ واریت، ظلم یا فکری جمود نے جگہ بنائی، تب خانقاہیں؛ امن، رواداری، خدمتِ خلق اور یکجہتی کی علامت بن گئیں اور اہلِ ایمان کی ایک زندہ روحانی سچائی بن کر ابھریں ۔

تصوف؛ دنیا سے فرار نہیں بلکہ خودی کی پہچان کا سفر ہے

تصوف کے افقِ نازپر ہی دلوں کی گہرائی، روح کی پاکیزگی اور ذات کی سچائی کی جھلک نمودار ہوتی ہے؛ جہاں قلبِ انسانی ربّی تجلیات کا آئینہ بن جاتا ہے۔ تصوف دنیا سے فرار کا فلسفہ نہیں، بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے ذات کے اندر جھانکنے، خودی کو پہچاننے اور رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ہمہ گیر، زندہ اور بامعنی سفر ہے بلکہ اپنے من میں ڈوب کر زندگی کے حقائق کو پالینے کا نام ہے تصوف ہے۔ بقول حضرت علامہ اقبال:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

حقیقی تصوف کی بنیاد اُس باطنی طہارت پر ہے جو انسان کو مخلوق کی خدمت اور خالق کی طلب کے حسین امتزاج کی طرف لے جاتی ہے۔ یہی وہ چشمۂ فیض ہے جس سے اہلِ فقر و غنا نے سیرابی حاصل کی۔ وہ درویش، جن کے لباس میں سادگی، مگر نگاہوں میں ربانی جلال تھا۔ جنہوں نے تکیے پر نہیں، میدانِ عمل میں بیٹھ کر خلقِ خدا کی تربیت کی۔ ان کا فقر، محض ترکِ دنیا نہیں بلکہ دنیا کو اپنی مٹھی میں رکھ کر، دل کو اللہ کے حضور سجدہ ریز کرنا تھا۔

یہ صاحبانِ تسلیم و رضا وہ چراغ ہیں جنہوں نے ہر دور کے اندھیروں میں ایمان، استقامت اور اخلاص کا نور جلایا۔ ان کے دل قناعت کے سمندر اور ان کی روحیں رضا کے گلشن تھیں۔ ان کی تسلیم و رضا نے اُنہیں مقامِ قرب تک پہنچایا، جہاں ہر لمحہ رَضِيتُ بِاللهِ رَبًّا کی صدا بلند ہوتی۔ ان کے صبر،

خاموشی اور قربانیوں سے نہ صرف افراد سنورے بلکہ معاشرے نکھر گئے۔ ان کی مجلس میں دل نرم ہوتے، آنکھیں نم ہوتیں اور روحیں معطر ہو جاتیں۔

اسی سلسلۂ صفا کے روشن مینار، اولیاء اللہ ہیں۔ وہ نفوسِ قدسیہ جو رب کے عشق میں فنا ہو کر بقا کا پیغام بنے۔ جن کی زندگیاں قرآن کی زندہ تفسیر اور سنتِ مصطفیٰ ﷺ کی عملی تصویر تھیں۔ ان کی خامشی میں درس ہوتا اور ان کے سکوت میں ہدایت کی صدا گونجتی۔ وہ وہی لوگ تھے جنہیں ربِ کریم نے اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ. کا خطاب عطا فرمایا۔

تاریخِ انسانیت میں اگر کہیں دلوں کی دھڑکن، روح کی تڑپ اور ذات کی پہچان کا سراغ ملتا ہے تو وہ تصوف کے روشن آستانوں پر ہی ملتا ہے۔ تصوف کوئی مجرد فلسفہ یا دنیا گریز رویہ نہیں بلکہ یہ زندگی کہ تہہ میں اتر اکر اسے رب کی خوشبو سے معطر کرنے کا نام ہے۔ اس کا آغاز تب ہوا جب انسان نے اپنی فطرت میں سچائی، سادگی اور قربِ الٰہی کی جستجو محسوس کی اور اس کے سفر کا نقطۂ عروج وہ تھا جہاں انسان، رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا کہہ کر فنا میں بقا کا مزہ چکھنے لگا۔

اہلِ فقر و غنا، وہ درویش ہیں جنھوں نے بادشاہوں کے سروں پر دستِ کرم رکھا، خود خرقہ اوڑھ کر سلطانِ دل بنے۔۔۔ وہ جو چٹائی پر بیٹھے تھے، مگر دنیا ان کے قدموں میں جھکتی تھی۔۔۔ ان کے فقر میں وہ غنا تھی جو دنیا کی سلطنتوں کو شرما دے۔۔۔ ان کے در سے کوئی خالی نہ گیا، کیونکہ وہ خود خالی ہو کر رب کے خزانے سے لبریز ہو چکے تھے۔۔۔ یہی وہ صاحبانِ تسلیم و رضا اور بندگانِ خاص تھے، جنھوں نے ہر حال میں رب کی مرضی کو اپنی چاہت بنالیا۔۔۔ جن کے چہروں پر سکوں کی روشنی اور دلوں میں تسلیم کی نرمی ہوتی۔ جنھوں نے درد کو دعا بنا دیا اور آزمائش کو وسیلۂ قرب سمجھا۔ اُن کے قدموں سے جو راستے بنے، وہ آج بھی سالکانِ تصوف کے لیے مینارۂ نور ہیں۔

ان نفوسِ قدسیہ کی اصلاحِ احوال کی روح پرور کوششوں کے ثمرات فرد کی اصلاح سے بڑھ کر معاشرے کی تعمیر تک پہنچے۔ محبت، اخوت، عفو، تحمل اور ایثار جیسے خزانے، انہی درویشوں کے آنگن سے نکلے۔ ان کی محافل میں دل گداز ہوتے، اور ان کی صحبت میں سنگ دل نرم پڑتے۔ وہ وقت کے نباض بھی تھے اور دلوں کے جراح بھی۔ یہ بندگان خدا اس نورِ روحانیت سے معمور ہوتے ہیں جو دل کے آئینے میں رب کی جھلک دکھاتے ہیں۔

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

اور یہ جھلک، اہلِ فقر و رضا کی زندگیوں میں ایک مشعل بن کر، آج بھی راہ نوردانِ شوق کو منزل کا پتا دیتی ہے۔

یہ وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے باطن کو تسخیر کیا بلکہ خلقِ خدا کے لیے ہدایت کا چراغ بنے۔ ان کی زندگی قرآن کی تفسیر اور سنتِ رسول ﷺ کا عملی نمونہ ہوتی ہے۔ ان کا مقام محض زہد و عبادت تک محدود نہیں، بلکہ وہ اخلاقِ محمدی کے مجسم آئینے اور فطرتِ انسانی کے اصلی معمار ہوتے ہیں۔ ان کے سکوت میں خطبے ہوتے ہیں اور ان کی خاموشی میں وہ صدائیں سنائی دیتی ہیں جو دلوں کو رب سے جوڑ دیتی ہیں۔ نہ وہ تخت کے طلبگار ہوتے ہیں، نہ تعظیم کے خواہاں، مگر ربِ جلیل انہیں وہ عزت عطا کرتا ہے جو شاہوں کے سروں پر سایہ کرتی ہے۔

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

دراصل وہی ہستیاں وارثانِ نبی ﷺ ہیں، جو ہر دور میں تصوف کے گلشن کو سرسبز رکھتے ہیں۔ ان کی یاد، ان کی تعلیمات اور ان کے فیوض آج بھی اہلِ دل کے لیے ایک ایسا چشمۂ حیات ہے جو تشنگانِ معرفت کو سیراب کر رہا ہے۔

برصغیر میں خانقاہی نظام کا منظر نامہ

آج جب خانقاہوں پر بسا اوقات رسومات کا غلبہ اور اصلی تعلیمات سے دوری کا منظر دکھائی دیتا ہے، تو لازم ہے کہ ہم ان آستانوں کو اُن کے اصل مزاج کی طرف لوٹائیں۔ وہ مقام، جہاں کوئی دھمال نہ ہو بلکہ فقط دَم ہو۔۔۔ افسانے نہ ہوں بلکہ فقط قرآن و سنت کا عطر ہو۔۔۔ دنیاداری کی سودے بازی نہ ہو، فقط رضا کا سودا ہو۔ خانقاہی نظام تصوف کی اس شمع کا نام ہے جو صدیوں سے قلوب کو روشنی عطا کرتی آئی ہے۔ یہ نظام آج بھی حیات بخش ہے، بشرطیکہ ہم اسے اس کے اصل خمیر، اس کی اصل روح اور اس کے حقیقی کردار کے ساتھ سمجھیں اور اپنائیں۔

جب روحانیت کو دنیاداری کی کوٹھڑی میں قید کر دیا جائے، جب تصوف کی خوشبو پیسے کے عطر میں بجھنے لگے اور جب خانقاہیں دلوں کی تطہیر کے مراکز کی بجائے حرص و ہوس کی منڈیاں بن جائیں، تو یہ محض ایک فکری انحراف نہیں بلکہ ایک گہرا معاشی و نفسیاتی انحطاط ہوتا ہے۔ اس انحطاط کی کوکھ سے ایک ایسا استحصالی نظام جنم لیتا ہے جو روحانی وابستگی کو مالی سرمایہ کاری میں بدل دیتا ہے اور دلوں کے سکون کو خانقاہی وفاداری کی قیمت پر نیلام کرتا ہے۔ یہاں عقیدت ایک کرنسی بن جاتی ہے اور مرشد کا

مقام روحانی تربیت کے بجائے سماجی بالادستی اور معاشی کنٹرول کا ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسی فضا میں روحانیت ایک داخلی سفر نہیں بلکہ خارجی مظاہر کا کھیل بن جاتی ہے، جہاں ظاہر پرستی، شخصیت پرستی اور مادی منفعت روحانی جوہر کو نگلنے لگتی ہے۔

یہ خانقاہیں، جن کے بانیان نے زہد و تقویٰ کو شعار بنایا، آج ان کے سجادہ نشین اپنی گدیوں کو موروثی اقتدار کی کرسی سمجھ بیٹھے ہیں۔ ''روحانی فیض'' کے نام پر جہالت کو فروغ دیا جارہا ہے، اور عقیدت مندوں کی جیبیں چپ چاپ خالی کی جارہی ہیں۔ چادریں چڑھتی ہیں، نقد نذرانے چمکتے ہیں اور صدقے کے بکروں سے لے کر نقدی کے لفافوں تک سب کچھ ایک ایسے نظام میں ڈھل چکا ہے جو بظاہر روحانی ہے مگر باطن میں خالص مادی اور دنیاوی۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ اپنی نظم ''باغی مرید'' میں فرماتے ہیں:

نذرانہ نہیں، سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

یہ استحصال بڑا لطیف اور مہذب ہے۔ یہاں بندہ چیخ بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کے عقیدے کا خون چوسنے والا ایک ''پیر'' ہوتا ہے، جسے اس نے روحانی نجات دہندہ مان رکھا ہوتا ہے۔ زائرین، جو علم، شعور اور معاشی فہم سے ناآشنا ہوتے ہیں، نہایت خاموشی سے اپنی مزدوری، پنشن یا بچوں کی فیسیں، درباروں کے قدموں میں نچھاور کر دیتے ہیں، اس امید پر کہ شاید قسمت کا دروازہ کھل جائے۔

خانقاہی نظام کا یہ معاشی استحصال ایک ''روحانی فیکٹری'' کی شکل اختیار کر چکا ہے، جہاں عاملین، تعویذ نویس، خادم، نعت خوان اور مناجات گو سب کسی منظم ڈھانچے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان درباروں کے اطراف میں دکانیں، ہوٹل، ٹرانسپورٹ سروسز، حتیٰ کہ موبائل ایپلیکیشنز تک ایک مکمل معیشت کو جنم دے چکی ہیں۔ گویا یہ خانقاہیں محض روحانی مراکز نہیں رہیں، بلکہ چھوٹے درجے کی مملکتیں بن چکی ہیں۔

اس معاشی استحصال کے مضمرات نہ صرف عوام کی جیبوں پر پڑتے ہیں، بلکہ قومی شعور، فکری آزادی اور دینی بصیرت کو بھی گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ جب قوم کے محروم طبقے کو تعلیم اور ہنر کی بجائے تعویذ اور دم درود کی بھیک پر لگا دیا جائے، تو معیشت صرف روپے میں نہیں، اقدار میں بھی دیوالیہ ہو جاتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تصوف کو اصل روح کے ساتھ زندہ کیا جائے، خانقاہوں کو علم و شعور کے مراکز میں بدلا جائے، اور اس نظام کو شفاف اور احتساب کے دائرے میں لایا جائے۔ بصورت دیگر، یہ خانقاہی کاروبار ہمارے معاشرتی نظام کی جڑوں میں دیمک بن کر بیٹھ جائے گا۔

خانقاہی نظام کے احیاء میں منہاج القرآن کا کردار

تصوف، اسلام کے جمالیاتی و روحانی حسن کا وہ زاویہ ہے جہاں دل حقیقتِ محمدی سے منور ہوتا ہے اور باطن، معرفتِ الٰہی کی روشنی میں نکھرتا ہے۔ برصغیر میں صوفیائے کرام نے جب روحانیت کا چراغ جلایا تو خانقاہیں اس نور کی قندیل بنیں۔ خانقاہی نظام برصغیر کی صوفی روایت کا وہ سرچشمہ ہے جس نے ہزاروں انسانوں کو روحانی حیات بخشی۔ حضرت معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت بہاؤالدین زکریا، اور حضرت شاہ ولی اللہ جیسے بزرگوں کی خانقاہیں علوم و معرفت، سلوک و طہارت اور خدمت خلق کے مراکز تھیں مگر وقت کے ساتھ جب روحانیت کے قافلے کو مادّہ پرستی کی گرد نے آ لیا، تو انہی خانقاہوں میں تقدس کی بجائے جمود اور اخلاص کی جگہ استحصال نے ڈیرے ڈال لیے۔ خانقاہوں میں سجادگی موروثی بن گئی، مریدی کاروبار بن گئی اور روحانیت کا دروازہ چند مخصوص خانوادوں کی جاگیر بنتا گیا۔ علمی و فکری تربیت کی جگہ تعویذ و عملیات نے لے لی اور مجاہدۂ نفس کے بجائے محض ظاہری رسوم نے تصوف کی اصل روح کو دُھندلا دیا۔ زائر، جو اصلاحِ نفس کا متلاشی تھا، ایک اندھے پیروکار میں بدل دیا گیا۔

(ا) منہاج القرآن: روحانیت کی نویدِ نو

ایسے ماحول میں تحریک منہاج القرآن ایک تازہ ہوا کا جھونکا بن کر سامنے آئی، جس نے تصوف کو نہ صرف اس کی اصل روح میں پیش کیا، بلکہ اسے ایک بیدار شعور، علمی بنیاد، اور اخلاقی تربیت کا منہج بنا دیا۔ تحریک منہاج القرآن، شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی قیادت میں، اس وقت منصہ شہود پر آئی جب خانقاہی نظام زوال پذیری کا شکار ہو چکا تھا۔ یہ تحریک، روحانیت کو ماضی کے جمود سے نکال کر موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے۔ اس تحریک نے تصوف کو محض وجد و حال، خواب و کشف یا مجربات کے خول سے نکال کر فکری بالیدگی، علمی روشنی اور عملی زندگی کے حسن سے جوڑ دیا۔

منہاج القرآن کے روحانی منہج میں تزکیۂ نفس، تطہیرِ قلب، تزکیۂ اعمال اور خدمتِ خلق کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ یہاں شیخ کی حیثیت استاد و مربی کی ہے، نہ کہ مافوق الفطرت ہستی کی۔ یہاں عقیدت

علم کی دہلیز پر سجدہ ریز ہوتی ہے، نہ کہ اندھی اطاعت کے محراب میں قید۔

(۲) منہاج القرآن اور تصوف کی اصل روح کی بازیافت

جب خانقاہوں کے چراغ، دنیاداری کے دھویں میں دھندلا گئے، جب روحانیت کے نخلستانوں کو خود غرضی کے ریگزاروں نے نگل لیا اور جب تزکیہ نفس کے چشمے، عقیدت کی آڑ میں استحصال کے زہر سے آلودہ ہو گئے، تب اُمتِ مسلمہ کی آنکھیں کسی ایسے چراغ کی متلاشی تھیں جو ان کے دل و دماغ کو نہ صرف روشنی دے، بلکہ انہیں بندگی کی اصل منزل کا پتہ بھی دے۔

ایسے میں تحریک منہاج القرآن انٹرنیشنل، ایک ایسا فکری و روحانی قافلہ بن کر ابھری، جس نے اسلام کی فکری اساس، روحانی پیغام اور تصوف کی اصل روح کو نئی زندگی عطا کی۔ اس تحریک نے، شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی قیادت میں، ان درباروں اور خانقاہوں کے مصنوعی طلسم کو چاک کیا جہاں نہ معرفت تھی، نہ مجاہدہ، نہ سلوک کا سچ تھا، نہ خدمتِ خلق کا رنگ، نہ بلند نگاہی، نہ زندگی کی تب وتاب بلکہ تصوف کے نام پر صرف پیری مریدی کا کاروبار تھا۔ بقول علامہ اقبال:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

ان دگرگوں حالات میں منہاج القرآن نے بندگی کو تعویذ کے دھندے سے نکال کر شعور کی روشنی میں رکھا۔ ذکرِ الٰہی کو ہوش و خرد کے ساتھ جوڑا۔ اس تحریک نے روحانیت کو صرف وجد و حال کے مظاہر سے بلند کر کے ایک متوازن زندگی، معاشرتی تطہیر، اخلاقی تربیت اور علمی بصیرت کا نام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ''تزکیہ نفس'' اس تحریک کی اساس ہے اور ''اصلاحِ باطن'' اس کا مرکزی پیغام ہے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تحریریں اور خطابات محض علمی مباحث نہیں بلکہ قلوب کی تطہیر کا وسیلہ بنے۔ اُنہوں نے تصوف کو ایک جامد فلسفہ نہیں، بلکہ متحرک عمل کے طور پر پیش کیا۔ سچائی، اخلاص، محبت، تحمل اور خدمتِ خلق کو روحانیت کا جوہر قرار دیا۔ منہاج القرآن کے تربیتی نظام، شب بیداریاں، حلقہ جاتِ درود، محافلِ ذکر، عرفانی لیکچرز اور روحانی اجتماعات میں جو نورانی فضا قائم ہوتی ہے، وہ دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ تصوف اب بھی دلوں کو زندہ کرنے کی قوت رکھتا ہے، اگر اس کا منہج قرآن اور سنت کی روشنی میں استوار کیا جائے۔

منہاج القرآن نے روحانیت کو طبقاتی غلامی سے نکال کر ہر فرد کے لیے قابلِ حصول بنا دیا۔ یہاں پیر اور مرید کا رشتہ خادم و مخدوم کا نہیں، بلکہ علم و محبت کا ہے۔ یہاں ہر وہ شخص جو سچائی کا متلاشی ہو،

اس تحریک کا ہمسفر بن سکتا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی رنگ و نسل، کسی بھی مسلک و مشرب یا مکتبِ فکر سے ہو۔

اس تحریک نے یہ ثابت کر دکھایا کہ خانقاہ صرف دیواروں کا نام نہیں، بلکہ وہ دل کی وسعت ہے جہاں اللہ بستا ہے۔ منہاج القرآن نے تصوف کو مسندوں سے اٹھا کر معاشرے میں اتارا، تاکہ ہر فرد بندگی کے سفر پر گامزن ہو سکے۔ یہ تحریک تصوف کو محض سلوک کی اصطلاحات سے نکال کر ایک ایسی شعوری تحریک میں بدل چکی ہے جو دلوں کو پاک کرتی ہے اور سماج کو سنوارتی ہے۔

درحقیقت، منہاج القرآن نے روحانیت کو علم، فہم اور عمل کے سانچے میں ڈھال کر اُمت کو وہ متاعِ گم گشتہ لوٹا دی ہے جو صدیوں سے محض رسوم و روایات کی گرد میں چھپی ہوئی تھی۔

(۳) منہاج القرآن کا روحانی تربیتی نظام

خانقاہی نظام میں تربیت کا محور عام طور پر ظاہری بیعت، وظائف اور روحانی مشاہدات ہوتے ہیں، جن میں دلیل کم اور جذبات زیادہ ہوتے ہیں۔ جبکہ منہاج القرآن نے تصوف کو کتاب و سنت کی بنیاد پر استوار کیا۔ اس تحریک کے روحانی تربیتی نظام میں سیرۃ النبی، تفاسیر قرآن، حدیث، فقہ، اور اخلاقی مضامین شامل ہیں، جنہیں روحانی تزکیہ کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے۔

(۴) رسم کے مقابلہ میں علم کا فروغ

خانقاہی نظام میں اب بھی کئی مقامات پر تعلیم و شعور سے زیادہ رسوم و روایات کی گونج سنائی دیتی ہے جبکہ منہاج القرآن نے علم کو ہر روحانی سفر کی بنیاد قرار دیا۔ اس تحریک نے روحانیت کو یونیورسٹی کی سطح تک پہنچایا اور طریقت کو جدید فہم اور علومِ جدیدہ کے ساتھ مربوط کر کے اسے ایک عالمی سطح کی فکری تحریک میں ڈھال دیا۔

(۵) خدمتِ خلق اور معاشرتی روحانیت کا مرکز

خانقاہی نظام کا مثبت پہلو یہ رہا ہے کہ وہ درویشی اور سادگی کا مظہر رہا، تاہم جدید تقاضوں کے مطابق اس کا سماجی کردار محدود رہا۔ اس کے برعکس منہاج القرآن نے روحانیت کو خدمتِ خلق، تعلیم، صحت، بین المذاہب ہم آہنگی اور امن عالم کی تحریک بنا کر روحانیت کے دائرہ کار کو وسعت دی۔

خانقاہی نظام ہمارے روحانی ورثے کا ایک قابلِ فخر باب ہے، جس نے کئی صدیوں تک انسانوں کے دلوں کو اللہ سے جوڑنے کا کام کیا مگر وقت کے تغیر نے اس نظام کو زوال کا شکار کر دیا۔ تحریک منہاج القرآن نے اس عظیم ورثے کو جدید دور میں نئے رنگ، نئی روشنی اور نئے شعور کے ساتھ زندہ کیا۔ یہ ایک ایسی روحانی تحریک ہے جو ماضی کی پاکیزہ روایت کو حال کی ضرورتوں سے جوڑ کر مستقبل کی

راہیں روشن کر رہی ہے۔ تصوف کا اصل چہرہ وہی ہے جو شعور، محبت، علم، اخلاص اور خدمت سے روشن ہو اور اس چہرے کو تحریک منہاج القرآن نے آئینے کی طرح زمانے کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

(۶) پاکیزہ صوفیانہ ماحول کی تشکیل میں اہم کردار

اولیاء اللہ کے مزارات اسلامی تاریخ میں روحانی تربیت، اخلاقی ارتقاء اور دینی شعور کے مراکز رہے ہیں۔ ان عظیم ہستیوں کی زندگیوں کا اصل پیغام خالص توحید، اتباعِ سنت اور خدمتِ خلق تھا۔ ان مزارات اولیاء پر ہونے والی سرگرمیاں تقوی اور خدمتِ خلق سے عبارت تھیں۔ عوام نے بھی ان مزارات کو روحانی تربیت، دعا اور اصلاحِ احوال کے مراکز کے طور پر اپنایا لیکن بد قسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مقدس مقامات پر ایسی خرافات نے جگہ بنالی جو دین کی روح اور شریعت کے اصولوں کے خلاف ہیں۔ ان درباروں پر غیر شرعی رسومات، خرافات اور بدعات کا راج ہو گیا، جنہوں نے ان مقامات کی اصلی روح کو مسخ کر دیا۔

ایسے میں تحریک منہاج القرآن نے ان مقامات کو دین، علم، اخلاق اور روحانیت کے اصل مراکز میں بدلنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی قیادت میں دین اسلام کے اصل پیغام کو عام کرنے اور خرافات کا قلع قمع کرنے کے لیے علمی، فکری اور عملی اقدامات کیے۔ مزارات پر ہونے والی محافل کو محافل ذکر و فکر، مجالسِ حمد و نعت، دروسِ قرآن و حدیث اور روحانی تربیت کے ذریعے دین سے ہم آہنگ کیا۔ ان محافل میں عوام الناس کو توحید، رسالت، قیامت، عبادات، اخلاق اور خدمتِ انسانیت جیسے بنیادی اسلامی موضوعات سے روشناس کروایا جاتا ہے۔

منہاج القرآن کی ان کاوشوں نے لوگوں کو روحانی بالیدگی، قلبی سکون اور اخلاقی تربیت کا راستہ دکھایا۔ ان محافل کا مقصد محض رسوم نہیں بلکہ دلوں کی اصلاح، اعمال کی تطہیر اور سوسائٹی میں خیر کا فروغ ہے۔ ان محافل میں مرد و خواتین کی الگ نشستوں، باحجاب ماحول اور باقاعدہ تربیتی پروگراموں کا اہتمام کیا جاتا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ منہاج القرآن محض جذباتی نہیں بلکہ علمی و فکری بنیادوں پر معاشرے کی اصلاح چاہتی ہے۔

شخصیت پر سماجی ماحول کے اثرات

عبدالستار منہاجین

نفسیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر شخص کا مزاج اس کے قریبی دوستوں کے مزاج کا اوسط ہوتا ہے۔ یعنی جیسی سوچ اور مزاج کے لوگوں کو ہم اپنا قریبی دوست بناتے ہیں، ہماری سوچ اور ہمارا مزاج بھی کم و بیش ویسا ہی بنتا چلا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا اِنحصار انسانی رویوں اور باہمی تعلقات کے گہرے مشاہدے پر مبنی ہے۔ انسان ایک سماجی مخلوق ہے اور اُس کی شخصیت اور عادات پر اِرد گرد کے لوگوں کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ یہ اثرات اس کے اَفکار، نظریات، رویوں اور حتیٰ کہ اس کے معمولاتِ زندگی میں بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

دوستی اِنسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ دوست وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے ہم اپنے جذبات، خیالات اور تجربات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اُن کی موجودگی اور خیالات نہ صرف ہمارے مزاج پر اثرانداز ہوتے ہیں بلکہ ہمارے فیصلوں، اَہداف اور زندگی کی سمت کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ نفسیات کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہمارے دوست خوش مزاج، مثبت سوچ رکھنے والے اور حوصلہ افزائی کرنے والے ہوں تو ہمارا رویہ بھی اُنہی خطوط پر اُستوار ہوتا ہے۔ جبکہ اِس کے برعکس، اگر ہمارے قریبی لوگ منفی خیالات کے حامل ہوں یا اُن کی زندگی میں مایوسی ہو تو یہ اثرات ہمارے مزاج پر بھی مرتب ہونے لگتے ہیں۔

اگر ہم شاعرانہ مزاج لوگوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا شروع کر دیں تو ہم بھی شاعری میں دلچسپی لینے لگیں گے۔۔۔ اگر ہمیں ہر معاملے کو سائنسی بنیادوں پر پرکھنے والوں کا ساتھ مل جائے تو ہم بھی سائنسی مزاج اپنا لیں گے۔۔۔ اگر ہم مایوس لوگوں کے ساتھ بیٹھیں گے تو مایوسی کی باتیں کرنے لگیں گے۔۔۔ اگر ہم پُراُمید لوگوں کے ساتھ دوستی لگاتے ہیں تو خود بخود مایوس رہنا چھوڑ دیں گے۔۔۔ اگر ہم تنقیدی مزاج رکھنے والے لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے لگیں تو کچھ عرصہ میں ہم بھی تنقیدی مزاج اپنا لیں گے۔۔۔ اگر ہم حقیقت کا سامنا کرنے کی بجائے خوش فہمیاں پالنے والے لوگوں کے ساتھ بیٹھیں گے تو اُنہی کی طرح حقیقت سے نظریں چرانا شروع کر دیں گے۔۔۔ اگر ہم ذو معنیٰ پوسٹس کر کے وسوسہ اندازی کرنے والوں کے ساتھ دوستی لگائیں گے تو ایک دن خود بھی وسوسوں کی زد میں ضرور آئیں گے۔

الغرض عام زندگی کی طرح سوشل میڈیا پر بھی جیسے لوگوں کو ہم اپنے سوشل سرکل میں شامل کرتے ہیں، ایک دن ہم بھی اُنہی جیسے بن جاتے ہیں۔

عادتیں کیسے اثرانداز ہوتی ہیں؟

علمِ نفسیات کی رو سے دوستوں کی عادات اور رویّے ہماری زندگی پر ضرور اثرانداز ہوتے ہیں۔ ایک مشہور فلسفی کا قول ہے کہ کسی کا قرب پانے کیلئے اُس کا ہمخیال ہونا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم عموماً اُن لوگوں کے قریب ہوتے ہیں جن کے خیالات، نظریات اور عقائد ہم سے ملتے جلتے ہوں۔ یہ

فکری ہم آہنگی نہ صرف دوستی کو مضبوط کرتی ہے بلکہ ہماری شخصیت پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ جب ہم کسی کو دوست بناتے ہیں تو لاشعوری طور پر رفتہ رفتہ اُس کے ساتھ ہم آہنگی بھی اِختیار کرنے لگتے ہیں۔

اسی طرح دوستوں کی مذہبی سوچ اور سیاسی وابستگی بھی ہماری شخصیت میں جھلکتی ہے۔ اگر ہمارے دوست کسی خاص مذہبی یا سیاسی نظریہ کے حامل ہیں تو ہم جتنا مرضی اِنکار کرتے رہیں، وقت کے ساتھ ساتھ ہم بھی اُن کے نظریات کو اپنانے لگتے ہیں۔ یہ اَثرات کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر ہماری سوچ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ آن لائن دوستیاں بھی اِسی طرح مذہبی و سیاسی اَثرات پیدا کرتی ہیں۔

سماجی رویےّ بھی دوستوں کے اَثرات سے محفوظ نہیں رہتے۔ اگر کسی کے دوست معاشرتی طور پر فعّال اور دوسروں کی مدد کرنے والے ہیں تو اُس شخص میں بھی یہ عادت پیدا ہو سکتی ہے۔ اِسی طرح اگر کسی کے دوست غیر ذمہ دار یا منفی رویہ رکھتے ہیں، لوگوں پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور ان کی غیبت کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تو یہ اَثرات بھی اُس کی اپنی زندگی کا بھی حصہ بن سکتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر کھلے عام گالی گلوچ کرنے والوں اور درپردہ معنیٰ خیز پوسٹس کرکے دوسروں کی تضحیک کرنے والوں کے ساتھ دوستی رکھنے والے بھی لامحالہ اِسی ڈگر پر چل پڑتے ہیں۔

علم نفسیات میں مختلف نظریات اِس موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اِنسان کی شخصیت اور رویےّ پر ماحول اور تعلقات کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ذیل میں چند نظریات کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ سماجی اَثرات کا نظریہ بتاتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے اہم فیصلے اور رویئے عموماً اپنے قریبی لوگوں کے اَثرات کے تحت شعوری طور پر اِختیار کرتے ہیں۔ یہ اَثرات ہمیں ایک خاص طرزِ زندگی، خیالات اور عادات کو اپنانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

۲۔ عکاسی نظریہ کہتا ہے کہ انسان اپنے قریبی لوگوں کی عادات اور رویوں کو غیر شعوری طور پر اپنانا شروع کر دیتا ہے۔ اس صورت میں ضروری نہیں کہ ہمیں کسی کام کے کرنے پر اُکسایا یا ورغلایا جائے، ہم لاشعوری طور پر اپنے دوستوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جیسے دوست ہم اپناتے ہیں ہم خود بھی ویسے ہی بنتے چلے جاتے ہیں۔

پس اگر ہمارے دوست مثبت سوچ رکھتے ہوں گے تو اُن کا ساتھ ہم پر بھی مثبت اَثرات چھوڑے گا۔ اور اگر ہمارے دوست منفی سوچ کے حامل ہیں اور دوسروں کیلئے اذیت کا باعث بننے والے ہیں تو یہ منفی رویہ ایک دن اَثر ہماری شخصیت کا حصہ بھی ضرور بن جائے گا۔

دوستوں کے اِنتخاب کی اہمیت

دوستوں کا اِنتخاب زندگی کا ایک اہم فیصلہ ہوتا ہے۔ اچھے دوست ہماری زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں، جبکہ برے دوست ہماری ترقی اور خوشی میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ دوستی کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کریں جو:

- ✯ مثبت سوچ رکھتے ہوں۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے اور اُن کے کام آنے والے ہوں۔ حوصلہ افزائی کرنے والے اور مشکل وقت میں کام آنے والے ہوں۔
- ✯ اچھی اَخلاقی اَقدار کے حامل ہوں۔ غیبت اور چغلی کرنے والے نہ ہوں۔ دوسروں کی کمزوریاں تلاش کر کے اُچھالنے والے اور طعن زنی کرنے والے نہ ہوں۔
- ✯ زندگی میں مقصد رکھتے ہوں۔ اگر ہمارے دوست زندگی میں کوئی مقصد نہیں رکھتے، محنت سے بھاگتے ہیں تو ہم بھی اُنہی جیسے بن کر ناکام ہو جائیں گے۔

دوستی کے تعلقات کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔ اگر کسی دوست کا رویہ ہماری زندگی پر منفی اَثر ڈال رہا ہے تو اُس سے دوری اِختیار کر لینا ہمارے لیے بہتر ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارے دوست ہمارے مزاج، عادات اور شخصیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ یہ اَثرات مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی۔ اِس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے دوستوں کا اِنتخاب سوچ سمجھ کر کریں اور اپنی زندگی میں بہتری اور خوشی کا باعث بننے والے لوگوں سے دوستی لگائیں۔ دوستوں کے اَثرات کو سمجھنا اور اُن کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا ہماری شخصیت کی ترقی کیلئے بہت اہم ہے۔ چنانچہ سوشل میڈیا پر بھی ہمیں مثبت سوچ رکھنے والوں کو دوست بنانا چاہئے اور منفی سوچ کے ساتھ مسائل کھڑے کرنے والوں سے دُوری اِختیار کر لینی چاہئے۔ جو لوگ بنا سوچے سمجھے سوشل میڈیا پر ہزاروں کی تعداد میں فرینڈ بنا لیتے ہیں اُن کا وسیع سوشل سرکل اُن کی سوچ و عمل پر اُسی طرح اثر انداز ہونے لگتا ہے جیسے عام زندگی کے دوست ہوتے ہیں۔ اِس لئے ہمیں سوشل میڈیا پر بھی دوستوں کے چناؤ میں خاص اِحتیاط کرنی چاہئے۔ سوشل میڈیا پر بھی ہمیشہ مثبت توانائی رکھنے والوں کو اپنا دوست بنائیں اور منفی سوچ رکھنے والوں کے شر سے بچنے کیلئے اُنہیں اَن فرینڈ کر دیں۔

17 جون: شہدائے ماڈل ٹاؤن کی 11 ویں برسی
دنیا بھر میں دعائیہ تقریبات کا انعقاد

17 جون 2014ء کو ماڈل ٹاؤن لاہور میں ریاستی جبر و تشدد کے ایک دلخراش واقعے میں 14 نہتے کارکنان، جن میں خواتین بھی شامل تھیں، پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ اس سانحے میں 100 سے زائد افراد زخمی ہوئے۔ یہ واقعہ نہ صرف انسانی حقوق کی پامالی کی ایک کڑی مثال تھا بلکہ انصاف کے نظام کی کمزوری اور طاقتور عناصر کے اثر و رسوخ کا مظہر بھی بن کر سامنے آیا۔ سانحہ ماڈل ٹاؤن کی 11 ویں برسی کے موقع پر پاکستان عوامی تحریک اور تحریک منہاج القرآن کی جانب سے دنیا بھر میں دعائیہ تقریبات اور یادگاری نشستوں کا انعقاد کیا گیا۔ یہ تقاریب صرف ایک روایتی یادگاری عمل نہیں تھیں بلکہ یہ ان مظلوموں کے خون سے کیے گئے عہد کی تجدید بھی تھیں کہ جب تک مکمل انصاف نہیں ملتا، جدوجہد جاری رہے گی۔

مرکزی تقریب لاہور میں جامع شیخ الاسلام میں منعقد ہوئی جہاں شہداء کی ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی، اجتماعی دعا اور روح پرور نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر تحریک منہاج القرآن کے بانی و سرپرست اعلیٰ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے ویڈیو لنک کے ذریعے خطاب کیا۔ انہوں نے قوم، عدلیہ اور مقتدر حلقوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”مقتدر حلقوں سے کہتا ہوں کہ سانحہ ماڈل ٹاؤن کے انصاف کے بند دروازوں کو کھولا جائے۔ قوم کو معلوم ہونا چاہیے کہ 17 جون 2014ء کے ریاستی قتلِ عام کے ذمہ دار کون ہیں؟ خواتین کا

خون کیوں بہایا گیا؟ اگر سپریم کورٹ نے 2019ء میں جے آئی ٹی بنانے کا حکم دیا تھا تو آج تک اس پر عمل کیوں نہیں ہوا؟ پانچ سال سے انصاف کا عمل رکا ہوا ہے، جو کہ عدالتی نظام کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ اس جے آئی ٹی نے 281 افراد کے بیانات قلمبند کیے مگر لاہور ہائی کورٹ نے اسے مزید کام کرنے سے روک دیا۔ 13 فروری 2020ء کو سپریم کورٹ نے لاہور ہائیکورٹ کو حکم دیا کہ جے آئی ٹی کے حوالے سے کیس کو 3 ماہ میں نمٹا دیا جائے مگر پانچ سال گزرنے کے باوجود اس حکم پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ یہ سب کچھ ایک گہری سازش، نظام عدل کی کمزوری اور طاقتور مجرموں کے اثر و رسوخ کی نشاندہی کرتا ہے۔‘‘

پاکستان عوامی تحریک کے سیکرٹری جنرل خرم نواز گنڈاپور نے مرکزی قائدین کے ہمراہ شہداء کی یادگار پر پھولوں کی چادر چڑھائی، فاتحہ خوانی کی اور میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم 11 سال سے عدالتوں کے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں۔ ناانصافی کے یہ 11 سال انصاف کا مذاق اور قوم کے ساتھ ظلم ہے۔ کمزور کی آہیں آسمانوں تک جاتی ہیں اور قومیں صرف ناانصافی سے تباہ ہوتی ہیں۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ اور چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ جے آئی ٹی اور دیگر زیر التوا درخواستوں پر جلد فیصلے کریں تاکہ انصاف کا عمل بحال ہو۔

مرکزی تقریب کے بعد مرکزی قائدین پر مشتمل وفود نے شہدائے ماڈل ٹاؤن کے ورثاء کے گھروں کا دورہ کیا۔ اس موقع پر ان سے اظہارِ تعزیت، دعاؤں اور عزمِ وفا کا اعادہ کیا گیا کہ یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی، انصاف کے لیے جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ظالموں کو ان کے منطقی انجام تک نہ پہنچا دیا جائے۔ سانحہ ماڈل ٹاؤن کا واقعہ آج بھی پاکستانی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے، جو ریاست، عدلیہ اور انسانی حقوق کے اداروں سے مسلسل سوال کرتا ہے۔ 11 برس گزرنے کے باوجود شہداء کے لواحقین کو انصاف نہیں مل سکا، جو نظامِ عدل کی سست روی اور سیاسی مداخلت کی نشان دہی کرتا ہے۔ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری اور عوامی تحریک کی قیادت نے ایک بار پھر اعلان کیا کہ:

’’خون کا ہر قطرہ گواہی دے رہا ہے، ظلم اور جبر کے خلاف ہماری جدوجہد کبھی نہیں رکے گی۔ انصاف صرف ایک مطالبہ نہیں، شہداء کا حق ہے۔‘‘

From east to west, your vision spread, A light in darkness where hope had fled.

(Abu Adam Al-shiraazi)

From the blessed land of Jhang, you rose,
A servant of Allah, whom the Prophet ﷺ chose.
Not for wealth, nor for throne or fame,
But to revive hearts with the beloved's name.

Your nights knew no rest, your will stood tall,
A mission divine, for the world to hear its call.
Through hunger, hardship, trial, and strife,
With faith unshaken and your vision in sight.

Minhaj-ul-Quran, a mercy bestowed,
A river of guidance that ceaselessly flowed.
From east to west, your vision spread,
A light in darkness where hope had fled.

With pen and speech, you turned the tide,
Restoring the truth with knowledge to guide.
When enemies rose, you stood unshaken,
A defender of Deen, with resolve unbroken.

Yet the greatest sign of Allah's decree
Lies in your bloodline, for all to see.
Dr. Hassan Mohiuddin Qadri, wise and rare,
Carries your torch with devotion and care.

Dr. Hussain Mohiuddin Qadri, inspirational and dynamic,
His vision, like yours, majestic and panoramic.

Shaykh Hammad, a star so bright,
A moon reflecting his grandfather's light.
With words like pearls and a heart so pure,
A legacy strong, forever secure.

And Shaykh Ahmad, a rising star,
Whose influence will reach both near and far.
His words will inspire, like a guiding flame,
In history's pages, they'll etch his name.

Oh, Qibla Huzoor, my master, my guide,
Your humble servant, with devotion and pride,
Not by worth, nor by claim,
Only lives to serve in your name.

Ya Allah, grant my Shaykh Your endless grace,
Elevate his rank, let him bask in Your embrace.
Make his mission strong and his burden light,
Surround him always with Your divine insight.

Let me remain in service, never to stray,
A lover in his path till my final day.
For my deeds are few, my sins are grave,
O Shiraazi, I have nothing to claim, except that I am Tahir's slave.

ماہنامہ منہاج القرآن

فی شمارہ: 60 روپے
سالانہ خریداری: 700 روپے

اپنے علاقے میں موجود پبلک لائبریریز، کالجز، سکولز، عوامی مقامات، دوست احباب
اور علاقے کی موثر شخصیات کو سالانہ خریداری کی صورت میں تحفہ بھجوائیں

365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 042-111-140-140 Ext: 128
0300-8886334 Whatsapp: 0300-8105740
Web:www.minhaj.info Email:mqmujallah@gmail.com

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کی معرکہ آراء تصانیف

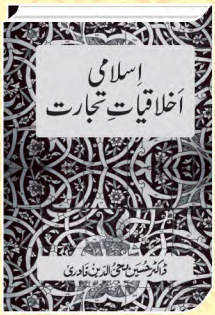

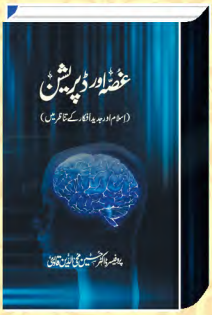

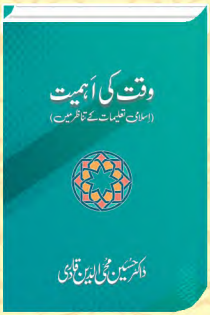

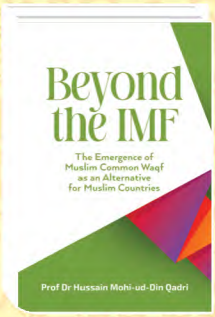

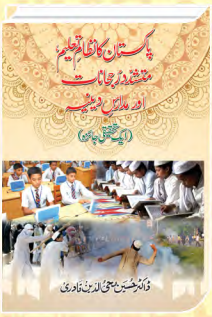

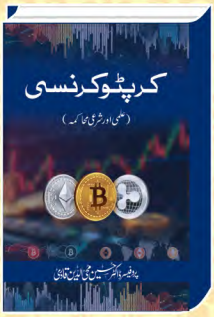

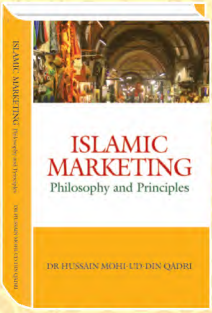

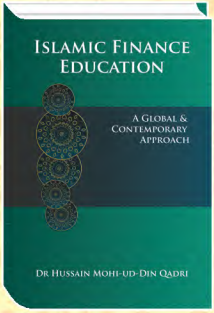

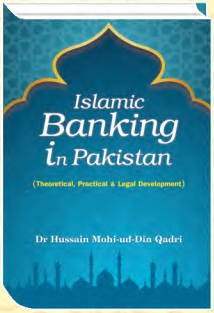

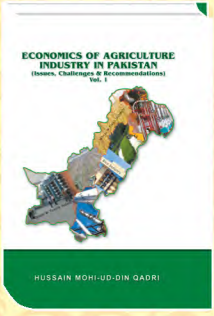

Monthly
MINHAJ-UL-QURAN LAHORE
JULY-2025
Regd CPL No.41

علمی و عملی، اخلاقی و روحانی، تعلیمی و سائنسی،
فقہی و قانونی، انقلابی اور فکری و عصری
موضوعات پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی
650 سے زائد کتب دستیاب ہیں